رجب المرجب ۱۴۴۵ھ

فروری ۲۰۲۴ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیمِ اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

ارضِ فلسطین

تاریخی پس منظر اور ہولناک مستقبل

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

سرورِ عالم، احمد مجتبیٰ، محمد مصطفیٰ ﷺ کی سیرتِ مطہرہ پر

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

داعی رجوع الی القرآن، بانی تنظیم اسلامی

کی جملہ کتب تین ضخیم جلدوں میں

سیرت النبی ﷺ سیریز

کے عنوان سے شائع ہوگئی ہیں!

دل نشیں انداز اور حسین پیرائے میں سیرتِ طیبہ کا بیان

صفحات: 950 ✿ معیاری کاغذ ✿ عمدہ طباعت
✿ دیدہ زیب ٹائٹل ✿ مضبوط جلد

مکمل سیٹ عمدہ اور نفیس پیکنگ میں

~~2500~~ روپے کے بجائے صرف 1500 روپے

فری ہوم ڈلیوری کے ساتھ

مکتبہ خدّام القرآن

36-K، ماڈل ٹاؤن، لاہور: فون: 3-(042)35869501
واٹس ایپ نمبر: 0301-111-5348 maktaba@tanzeem.org

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 73

شمارہ : 2

رجب المرجب 1445ھ

فروری 2024ء

فی شمارہ : 50روپے

سالانہ زرِتعاون : 500روپے

مُدیر

حافظ عاکف سعید

مجلس ادارت:

ایوب بیگ مرزا، خورشید انجم

نائب مُدیر

حافظ خالد محمود خضر

ادارتی معاون:

حافظ محمد زاہد، محمد خلیق

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700، فون: 3-35869501

فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: "دارُالاسلام" ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-(042)35473375

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال ———— 5

احیائے اسلام: جماعت سازی‘ خدشات‘ تدارک

ایوب بیگ مرزا

بیانُ القُرآن ———— 10

سورۃ التکویر+سورۃ الانفطار

ڈاکٹراسراراحمدؒ

بصائر ———— 23

ارضِ فلسطین: تاریخی پس منظر اور ہولناک مستقبل

ڈاکٹراسراراحمدؒ

حکمتِ قرآنی ———— 33

لقمان حکیم کی وصیتیں (۲)

مقصودالحسن فیضی

حسنِ معاشرت ———— 47

ادب اور احترام

شعبہ تعلیم وتربیت‘ تنظیم اسلامی

توضیح وتنقیح ———— 58

غزوۂ ہند کے بارے میں ارشاداتِ نبویؐ

طارق محمود ہاشمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

احیائے اسلام

جماعت سازی‘ خدشات اور تدارک

انسان کا معاملہ بہت عجیب ہے۔ وہ اکیلا اِس دنیا میں آتا ہے اور اکیلا ہی دارِفانی سے کوچ کر جاتا ہے‘ لیکن وہ مہد سے لحد تک کا سفر نہ اکیلا کرنا چاہتا ہے اور نہ ہی کر سکتا ہے۔ وہ کسی خاندان کے فرد‘ کسی قبیلے کے رُکن‘ کسی شہر کے شہری اور کسی ملک کے باشندے کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ اِسی لیے انسان کو معاشرتی حیوان کہا جاتا ہے‘ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کے لیے معاشرے کی وہی حیثیت ہے جو مچھلی کے لیے پانی کی ہے۔ انسان کی انفرادیت بڑی محدود ہے۔ وہ کئی چھوٹے موٹے روزمرّہ اُمور تنہا ہی کر لیتا ہے۔ وہ غور وفکر اور عملی طور پر کسی کام کا آغاز تو تنہا کر سکتا ہے‘ لیکن بذاتِ خود کسی ایسے کام کو منطقی انجام تک نہیں پہنچا سکتا جو معاشرے پر اچھے یا بُرے اثرات مرتّب کرے۔ ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اجتماعیت انسانی فطرت کا حصّہ ہے۔ لہٰذا انسان کی فطرت کی رُو سے یہ واجب ہے کہ وہ اپنے لیے سازگار معاشرہ تلاش کرے‘ اور اگر یہ میسر نہ ہو تو اپنی اخلاقی و روحانی تکمیل کے لیے پورے اخلاص کے ساتھ اس کو سازگار بنانے کی جِدّوجُہد کرے۔ مقصد کے حصول کے لیے اجتماعی دانش اور اجتماعی جدّوجُہد انسان کی ضرورت ہی نہیں مجبوری بھی ہے۔

انبیاء و رسل علیہم السلام کی بعثت کا بنیادی مقصد بلاشبہ افراد کی اخلاقی و روحانی تکمیل اور فلاح و نجات ہے‘ لیکن اس مقصد کے لیے سازگار اجتماعی ماحول مہیا کرنے کی جِدّوجُہد کرنا بھی بلاشبہ انبیاء و رسلؑ کے مقاصدِ بعثت اور فرائض ہائے منصبی میں شامل رہا ہے۔ عام انسان کی بات چھوڑیں‘ انبیاء اور رسل علیہم السلام نے بھی اپنے مشن کا آغاز تو تن تنہا کیا‘ لیکن حوارین اور صحابہ کرامؓ کی نصرت ہی سے مشن آگے بڑھا۔

اللہ تعالیٰ کے اولوالعزم رسولوں میں سے حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے ایک طرف تو اپنی قوم بنی اسرائیل پر ہونے والے سیاسی جبر واستحصال کے خلاف آزادی کی تحریک چلائی اور دوسری

طرف اللہ تعالیٰ کی معجزانہ مدد کے نتیجے میں اپنی قوم کی آزادی‘ کتاب وشریعت کے اُتارے جانے اور ایک جماعت فراہم ہو جانے کے بعد اس کے نفاذ کے لیے اپنی قوم سے اجتماعی جدّو جُہد کا مطالبہ کیا۔ البتہ قوم کی بزدلی آڑے آئی‘ بات آگے نہ بڑھ سکی اور دین نافذ نہ ہوسکا۔

اللہ کے آخری نبی اور رسول محمد مصطفیٰ ﷺ نے آ کر پہلی مرتبہ پوری انسانیت کو ایک محفوظ کتاب قرآن مجید کے ذریعے ایک کامل دین کی طرف نہ صرف دعوت دی بلکہ اس دعوت کو قبول کرنے والوں کی سمع و طاعت کے ٹھیٹھ اسلامی اُصول پر ایک مضبوط جماعت بنائی۔ اِس جماعت نے مال وجان کی جس طرح قربانیاں دیں اور جس جاں فشانی سے اِس مشن کے لیے وہ جُت گئے‘ انسانی تاریخ اُس کی مثال دینے سے قاصر ہے۔ اور بالآخر فتح مکہ پر حضور ﷺ کے تکبیرِ رب کے اُس مشن کی جزیرہ نمائے عرب کی حد تک تکمیل ہوگئی جس کا حکم آپؐ کو سورۃ المدثّر کی ابتدائی آیات میں دیا گیا تھا۔ خطبہ حجۃ الوداع میں شہادت علی الناس کا یہ فریضہ اپنی اُمّت کو منتقل کر کے آپ ﷺ رفیق اعلیٰ سے جاملے۔ حضور ﷺ نے جو نظامِ عدل وقسط قائم کیا‘ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے اُسے نہ صرف نکھارا بلکہ صرف تیس برس کے قلیل عرصے میں تین براعظموں تک پھیلا دیا۔ خلافتِ راشدہ کے اختتام پر‘ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی اختیار کردہ تعبیر کے مطابق‘ دین حق کے نظامِ عدلِ اجتماعی کی چھ منزلہ عمارت کی صرف چھٹی منزل منہدم ہوئی۔ بقیہ پانچوں منزلوں کو ایک ایک کر کے گرنے میں تقریباً ڈیڑھ ہزار سال لگے۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی کے آغاز میں یہ عمارت راکھ کا ڈھیر بن گئی‘ یعنی مسلمانوں نے خود ادارۂ خلافت کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا وہ عمارت جو اپنوں کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے اور غیروں کی سازشوں سے زمین بوس ہوگئی تھی اُسے ازسرِ نو کھڑا کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ کیا رحمۃٌ للعالمین ﷺ کے دیے ہوئے اُس عادلانہ نظام کو ماضی کا قِصّہ سمجھ لیا جائے؟ ہماری نظر میں ایسا کرنا صرف اپنی دنیا اور آخرت تباہ و برباد کرنا ہی نہیں بلکہ انسانیت سے دشمنی کا مظہر بھی ہے۔ ایسا کرنا انسانیت کو آگ کے سمندر میں پھینکنے کے مترادف ہے۔ آج دنیا ٹیکنالوجی میں انتہائی ترقی کے باوجود اور انسانوں کو زندگی میں بے شمار سہولتیں فراہم کرنے کے باوجود جہنّم زار بنتی چلی جارہی ہے۔ لہٰذا اُس عادلانہ نظام کو واپس لائے بغیر چارہ نہیں!

عالَمِ اسلام کی حالت یہ ہے کہ ہر گزرتا دن مسلمانوں کی پسپائی اور ہزیمت کی داستان سنا رہا ہے۔ اُمّتِ مُسلمہ کا اب کوئی حقیقی وجود نہیں ہے‘ مختلف مسلمان ممالک ہیں جہاں مغرب کا

سیاسی اور معاشی نظام اپنا قبضہ مکمل کر چکا ہے۔ روشن خیالی کے ٹائٹل کے ساتھ مغربی تہذیب و تمدن بھی اپنی جگہ بنا چکی ہے۔ یہ ہمہ جہتی یلغار اتنی کامیابی سے سرایت کر گئی ہے کہ آج کے اسلامی دانشور اور مفکّر خود اِسلام کے سیاسی پہلو پر انگلیاں اُٹھا رہے ہیں۔ ایسے سوال کھڑے کیے جا رہے ہیں کہ اِسلامی نظام کے قیام کی جِدّ و جہد کسی اِسلامی معاشرے کی ضرورت ہے بھی یا نہیں! یہ وہ دانشور ہیں جو ''آسان اسلام'' کے قائل ہیں۔ بد قسمتی سے گمراہی کی راہ پر گامزن ہیں اور شریعت میں ترمیم و تحریف کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً ان کے نزدیک سود لینا حرام اور ناجائز لیکن دینا حلال اور جائز ہے۔ وہ عورت کو اپنے تئیں ''پردے کی جکڑ بندیوں'' سے آزاد کر رہے ہیں۔ جمہوری نظام کے حوالے سے پروفیسر فرانسس فوکو ہاما کے فلسفہ End of History کے شدّت سے قائل ہیں۔ ہمیں اِن دانشوروں سے کچھ لینا دینا نہیں۔

البتہ دین سے انتہائی مخلص کچھ دانشور جو شریعتِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو من و عن قبول کرتے ہیں اور اُس پر عمل پیرا بھی نظر آتے ہیں' اُن کی علمی صلاحیتوں اور علمی کاوشوں کے ہم دل کی گہرائیوں سے معترف ہیں۔ اُنھیں بڑی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں' لیکن حیرت اِس بات پر ہے کہ وہ اقامتِ دین کی جِدّ و جُہد اور اُس کے لیے منظّم جماعت کا قیام غیر ضروری سمجھنے لگے ہیں۔ ایسے ہی ایک صاحبِ علم کے سامنے ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ نے چند سوالات رکھے تھے' جن کا ہم قارئین کے سامنے اعادہ کیے دیتے ہیں۔ پہلا سوال یہ تھا کہ: اگر کسی ملک کی آبادی کی عظیم اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہو تو اُس ملک میں کون سا نظام رائج ہونا چاہیے' اِسلامی نظام یا کوئی دوسرا نظام؟ دوسرا سوال یہ تھا کہ: اگر بد قسمتی سے وہاں اسلامی نظام قائم نہیں بلکہ غیروں کا نظام نافذ ہے تو مسلمان باشندوں کو اِسلامی نظام کے قیام کی کوشش کرنی چاہیے یا نہیں؟ کیا یہ کوشش ہر مسلمان انفرادی طور پر اپنے تئیں کرتا رہے یا اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کسی منظّم جماعت کی ضرورت ہے؟ ظاہر ہے ہر ذی شعور ہی نہیں' ذی ہوش بھی یہ کہے گا کہ مسلمانوں کو ایک منظّم جماعت بنا کر اِسلامی نظام کے قیام کی جدّ و جُہد کرنا چاہیے۔ یہی جواب اُن صاحبِ علم نے بھی دیا تھا۔ ہم اِس میں یہ اضافہ کیے دیتے ہیں کہ اگر یہ اِسلامی ملک پاکستان ہو تو بات محض اخلاقی ہی نہیں بلکہ دینی سطح پر مزید مؤکد ہو جاتی ہے' کیونکہ مسلمانانِ برصغیر نے اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اُنہیں ایک خطہ زمین عطا فرما دے تو وہ وہاں اُس کا دین نافذ کریں گے۔

جہاں تک اِس مقصد کے حصول کے لیے جماعت کی ضرورت و اہمیت کی بات ہے تو ایک طرف حضرت نوح علیہ السلام سے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک سلسلۂ رسالت پر نظر ڈالی جائے جبکہ دوسری

طرف اُنیسویں اور بیسویں صدی میں سائنسی ترقی اور صنعتی وثقافتی انقلابات کو دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ارتقائے زمانہ کے نتیجے میں انفرادیت کا دائرہ سکڑتا جا رہا ہے اور انسان کی اجتماعی زندگی کی اہمیت بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ لہٰذا آج اجتماعیت کی ناگزیریت پہلے سے کہیں زیادہ عیاں ہو رہی ہے۔ دین اسلام کا معاملہ تو یہ ہے کہ وہ سفر اور نماز میں دو افراد کو بھی جماعت کی صورت میں دیکھنا پسند کرتا ہے۔

جماعت سازی کے حوالے سے کچھ اندیشوں کا بڑی شدّت سے اظہار کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اس سے جماعتی وگروہی عصبیت کی لعنت اور شخصیت پرستی کی مہلک بیماری پیدا ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ خود جماعتیں عموماً داخلی انتشار کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں اوّلین بات تو یہ ہے کہ کون سا بڑا کام ہے جو اندیشوں سے خالی ہوتا ہے۔ جس چیز میں خیر کا پہلو غالب ہو اُس کو اختیار کرنا چاہیے اور اس کے اندیشوں سے بچاؤ کی ہر ممکن تدبیر کرنی چاہیے۔

''شخصیت پرستی'' کے پیدا ہونے کے امکانات وہاں زیادہ ہوتے ہیں جہاں صرف کسی ایک داعی کے اپنے خیالات ونظریات وتصوّرات اور اسی کے فہم وفکر ہی کو اس اجتماعیت میں ایک ایسے مرکز ومحور کی حیثیت حاصل ہو جائے جس پر کبھی کوئی سوال ہی نہ اُٹھایا جا سکے۔ اس کے برعکس اگر بہت سے لوگ باہمی مشاورت سے اپنے مقصد اور اس کے حصول کے طریق پر غور کرتے رہیں اور مسلسل اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ کی قرآنی ہدایت پر عمل پیرا رہیں تو ان شاء اللہ اس اندیشے کا سدِّباب ہو جائے گا۔ مزید یہ کہ دین کی خدمت کے لیے جمع ہونے والے لوگ ہمیشہ اِنَّنَا مِنَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ کے مطابق اپنے آپ کو اُمّتِ مُسلمہ ہی کا ایک حصّہ تصوّر کریں۔ چنانچہ نہ ان میں کوئی غرور وگھمنڈ پیدا ہو نہ اپنے ''چیزے دگر'' ہونے کا احساس پیدا ہونے پائے اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے کسی اعتبار سے بہتر وبرتر تصوّر کریں۔

یہاں یہ حقیقت بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ تفرقہ بازی محض جماعت سازی ہی سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ کوئی ادارہ یا محض درس گاہ یا دار العلوم بھی اس کا سبب بن سکتا ہے۔ درس گاہیں اور دار العلوم جہاں اسلامی تعلیمات عام کرنے کا عظیم کارنامہ سرانجام دے رہے ہیں وہاں یہ بھی ہوا کہ دین اسلام کو اپنے مسلک تک محدود کرنے کا طرزِ عمل سامنے آیا جو من دیگرم تو دیگری کی بنیاد بنا۔ اب نہ تو یہ صحیح ہے کہ ان خدشات کی بنا پر درس گاہیں اور دار العلوم قائم کرنے ہی بند کر دیے جائیں اور نہ ہی یہ درست ہے کہ دینی مقاصد کے حصول کے لیے جماعتیں قائم کرنا ممنوع قرار

دے دیا جائے۔ اس کے برعکس حتی الامکان ایسی احتیاطی تدابیر اختیار کی جانی چاہئیں کہ ان کے ذریعے اُمّت میں تفرقہ وانتشار پیدا نہ ہو۔

تیسرا اندیشہ جماعتوں کے ’’داخلی انتشار‘‘ کا ہے۔ اختلاف اس عالمِ واقعہ کی ایک عظیم اگرچہ تلخ حقیقت ہے۔ تحریکیں اُٹھتی ہیں اور بہت کچھ مفید کام کرتی ہیں‘ پھر ان میں داخلی انتشار رونما ہوجاتا ہے۔ اسی طرح مدارس میں باہمی سرپھٹول کے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ ان کا کام نسیاً منسیا ہوجاتا ہے۔ ان کے اثرات بہت بعد تک بھی باقی رہتے ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ خلوص اور للّٰہیت کے ساتھ کام شروع کیا جائے۔ اختلافات کے حل کے لیے صحت مند راستے حتی الامکان کھلے رکھے جائیں اور جہاں اختلاف نصوص اور بنیادی معاملات کا نہ ہو بلکہ صرف رائے اور تعبیر وتشریح کا ہو‘ تو جماعت کے نظم بالا کی رائے اور تشریح کو فوقیت دی جانی چاہیے۔ اس کے بعد بھی کبھی ناگوار صورتِ حال پیدا ہو تو اس کا سامنا کیا جائے۔

ہمارے نزدیک احیائے اسلام کا یہ عمل سادہ اور بسیط نہیں ہے بلکہ اس کے متعدد گوشے ہیں‘ جن میں سے ہر ایک میں اولوالعزم افراد اور جماعتیں برسرِکار ہیں۔ مثلاً تعلیمی وتدریسی‘ اصلاحی وتربیتی‘ تبلیغی ودعوتی‘ قومی وملّی اور انقلابی واحیائی‘ جو بظاہر ایک دوسرے سے جدا اور مختلف بلکہ بعض پہلوؤں کے اعتبار سے متضاد ہونے کے باوجود اِس وسیع تر احیائی عمل کے اعتبار سے ایک دوسرے کے لیے باعث تقویت ہیں اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے کے قابل ہیں۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ دین ومذہب کے مخالف اور لادینیت کے علمبردار تو پوری طرح منظّم ہوکر کام کر رہے ہیں اور ان کے مختلف گروہ اور جتھّے مختلف اطراف سے پوری تنظیم اور اجتماعیت کے ساتھ دینی قوتوں پر یلغار کر رہے ہیں‘ لیکن دینِ حق کے ماننے والے ابھی اِس بحث میں اُلجھے ہوئے ہیں کہ دینِ متین کے لیے اجتماعی جدّوجُہد ضروری ہے یا نہیں! یہاں ایک فرمانِ رسول ﷺ کا حوالہ دینا اس بحث کو منطقی انجام تک پہنچاتا ہے:

((اَنَا اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ، اَللّٰهُ اَمَرَنِیْ بِهِنَّ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ))

’’(مسلمانو!) مَیں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں‘ اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے۔ یعنی جماعت‘ سننا‘ اطاعت کرنا‘ ہجرت‘ اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔‘‘

نوٹ: اِس تحریر میں تنظیم اسلامی کے بنیادی لٹریچر ’’تعارفِ تنظیم اسلامی‘‘ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

❁❁❁

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُوْرَةُ التَّكْوِيْرِ

تمہیدی کلمات

سورۃ التکویر اپنے مضمون اور اسلوب کے اعتبار سے اپنے بعد والی تینوں سورتوں سے گہری مشابہت رکھتی ہے۔ اس مشابہت کی وجہ سے یہ چاروں سورتیں (التّکویر‘ الاِنفِطار‘ المُطفِّفِین اور الاِنشِقاق) ایک ضمنی گروپ کی حیثیت سے بھی پہچانی جاتی ہیں۔ البتہ جوڑوں کے نظم کے حوالے سے سورۃ التکویر کا تعلق سورۃ الانفطار سے ہے‘ جبکہ سورۃ المُطفِّفِین اپنے بعد والی سورت یعنی سورۃ الانشقاق کے ساتھ مل کر جوڑا بناتی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

اِذَا الشَّمۡسُ کُوِّرَتۡ ۪ۙ﴿۱﴾ وَ اِذَا النُّجُوۡمُ انۡکَدَرَتۡ ۪ۙ﴿۲﴾ وَ اِذَا الۡجِبَالُ
سُیِّرَتۡ ۪ۙ﴿۳﴾ وَ اِذَا الۡعِشَارُ عُطِّلَتۡ ۪ۙ﴿۴﴾ وَ اِذَا الۡوُحُوۡشُ حُشِرَتۡ ۪ۙ﴿۵﴾
وَ اِذَا الۡبِحَارُ سُجِّرَتۡ ۪ۙ﴿۶﴾ وَ اِذَا النُّفُوۡسُ زُوِّجَتۡ ۪ۙ﴿۷﴾ وَ اِذَا
الۡمَوۡءٗدَۃُ سُئِلَتۡ ۪ۙ﴿۸﴾ بِاَیِّ ذَنۡۢبٍ قُتِلَتۡ ۚ﴿۹﴾ وَ اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتۡ ۪ۙ﴿۱۰﴾
وَ اِذَا السَّمَآءُ کُشِطَتۡ ۪ۙ﴿۱۱﴾ وَ اِذَا الۡجَحِیۡمُ سُعِّرَتۡ ۪ۙ﴿۱۲﴾ وَ اِذَا الۡجَنَّۃُ
اُزۡلِفَتۡ ۪ۙ﴿۱۳﴾ عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّاۤ اَحۡضَرَتۡ ﴿ؕ۱۴﴾ فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالۡخُنَّسِ ۙ﴿۱۵﴾
الۡجَوَارِ الۡکُنَّسِ ۙ﴿۱۶﴾ وَ الَّیۡلِ اِذَا عَسۡعَسَ ۙ﴿۱۷﴾ وَ الصُّبۡحِ اِذَا تَنَفَّسَ ۙ﴿۱۸﴾
اِنَّہٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ کَرِیۡمٍ ﴿ۙ۱۹﴾ ذِیۡ قُوَّۃٍ عِنۡدَ ذِی الۡعَرۡشِ
مَکِیۡنٍ ﴿ۙ۲۰﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیۡنٍ ﴿ؕ۲۱﴾ وَ مَا صَاحِبُکُمۡ بِمَجۡنُوۡنٍ ﴿ۚ۲۲﴾ وَ لَقَدۡ
رَاٰہُ بِالۡاُفُقِ الۡمُبِیۡنِ ﴿ۚ۲۳﴾ وَ مَا ہُوَ عَلَی الۡغَیۡبِ بِضَنِیۡنٍ ﴿ۚ۲۴﴾ وَ مَا ہُوَ
بِقَوۡلِ شَیۡطٰنٍ رَّجِیۡمٍ ﴿ۙ۲۵﴾ فَاَیۡنَ تَذۡہَبُوۡنَ ﴿ؕ۲۶﴾ اِنۡ ہُوَ اِلَّا ذِکۡرٌ

لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۲۷﴾ لِمَنۡ شَآءَ مِنۡکُمۡ اَنۡ یَّسۡتَقِیۡمَ ﴿۲۸﴾ وَ مَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۲۹﴾

آیت ۱ ﴿اِذَا الشَّمۡسُ کُوِّرَتۡ ۪ۙ﴿۱﴾﴾ ’’جب سورج لپیٹ لیا جائے گا۔‘‘

آیت ۲ ﴿وَ اِذَا النُّجُوۡمُ انۡکَدَرَتۡ ۪ۙ﴿۲﴾﴾ ’’اور جب ستارے ماند پڑ جائیں گے۔‘‘

آیت ۳ ﴿وَ اِذَا الۡجِبَالُ سُیِّرَتۡ ۪ۙ﴿۳﴾﴾ ’’اور جب پہاڑ چلا دیے جائیں گے۔‘‘

آیت ۴ ﴿وَ اِذَا الۡعِشَارُ عُطِّلَتۡ ۪ۙ﴿۴﴾﴾ ’’اور جب گابھن اونٹنیاں چھٹی پھریں گی۔‘‘

العِشار سے دس مہینوں کے حمل والی اونٹنیاں مراد ہیں‘ یعنی ایسی اونٹنیاں جن کے وضع حمل کا وقت بہت قریب ہو۔ عربوں کے ہاں ایسی اونٹنی بہت قیمتی سمجھی جاتی تھی اور اس لحاظ سے وہ لوگ اس کی خصوصی حفاظت اور خدمت کرتے تھے۔ آیت میں اس حوالے سے قیامت کی ہولناک کیفیت کی تصویر دکھائی گئی ہے کہ جب قیامت برپا ہوگی تو بہت قیمتی اونٹنیاں بھی لاوارث ہو جائیں گی‘ انہیں کوئی سنبھالنے والا نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے اُس وقت جبکہ خود عورتوں کو اپنے حمل کی کوئی فکر نہیں ہوگی تو اونٹنیوں کی کسے ہوش ہوگی۔

آیت ۵ ﴿وَ اِذَا الۡوُحُوۡشُ حُشِرَتۡ ۪ۙ﴿۵﴾﴾ ’’اور جب وحشی جانور جمع کر دیے جائیں گے۔‘‘

عام طور پر جنگلی جانور ایک دوسرے سے دور بھاگتے ہیں‘ لیکن اس دن خوف کے مارے ان کی وحشت بھی جاتی رہے گی اور مختلف اقسام کے جانور بھی اکٹھے ہو جائیں گے۔

آیت ۶ ﴿وَ اِذَا الۡبِحَارُ سُجِّرَتۡ ۪ۙ﴿۶﴾﴾ ’’اور جب سمندر دہکا دیے جائیں گے۔‘‘

اگلی سورت یعنی سورۃ الانفطار میں سمندروں کے پھاڑے جانے ﴿وَ اِذَا الۡبِحَارُ فُجِّرَتۡ ۙ﴿۳﴾﴾ کا ذکر ہے۔ ان دونوں آیات پر غور کریں تو یوں لگتا ہے کہ جب زمین کو کھینچ کر پھیلایا جائے گا ﴿وَ اِذَا الۡاَرۡضُ مُدَّتۡ ۙ﴿۳﴾﴾ (الانشقاق) تو اس کی اندرونی تپش اوپری سطح پر آ جائے گی۔ چنانچہ دہکتے ہوئے لاوے کے عین اوپر سمندر اُبل رہے ہوں گے اور اس طرح سمندروں کا پانی بخارات بن کر ہوا میں تحلیل ہو جائے گا۔ واللہ اعلم!

آیت ۷ ﴿وَ اِذَا النُّفُوۡسُ زُوِّجَتۡ ۪ۙ﴿۷﴾﴾ ’’اور جب جانوں کے جوڑ ملائے جائیں گے۔‘‘

یعنی پوری نسلِ انسانی کے مختلف افراد کی گروہ بندی کر دی جائے گی۔ یہ گروہ بندی لوگوں کے اعمال اور انجام کے حوالے سے ہوگی جیسے سورۃ النمل‘ آیت ۸۳ اور سورۂ حٰمٓ السجدۃ‘ آیت ۱۹

میں اہلِ جہنّم کو مختلف گروہوں میں تقسیم کیے جانے کا ذکر آیا ہے۔ اس آیت کا مفہوم یہ بھی لیا گیا ہے کہ جب جانیں جسموں کے ساتھ جوڑ دی جائیں گی۔

آیت ۸ ﴿وَاِذَا الۡمَوۡءٗدَۃُ سُئِلَتۡ ۪ۙ﴿۸﴾﴾ ''اور جب زندہ دفن کی گئی لڑکی سے پوچھا جائے گا۔''

آیت ۹ ﴿بِاَیِّ ذَنۡۢبٍ قُتِلَتۡ ۚ﴿۹﴾﴾ ''کہ وہ کس گناہ کی پاداش میں قتل کی گئی تھی؟''

یہ تذکیر وانذار کا بہت لطیف انداز ہے۔

آیت ۱۰ ﴿وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتۡ ﴿۱۰﴾﴾ ''اور جب اعمال نامے کھول دیے جائیں گے۔''

آیت ۱۱ ﴿وَاِذَا السَّمَآءُ کُشِطَتۡ ﴿۱۱﴾﴾ ''اور جب آسمان کی کھال اُتار لی جائے گی۔''

یعنی آسمان پر سے پردہ اُٹھا دیا جائے گا اور اس کے وہ سب رموز اور مناظر جو انسانوں کی نظروں سے پوشیدہ تھے ان پر ظاہر ہو جائیں گے۔ اس سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ آسمان اس دن کھال اُترے ہوئے کسی جانور کے جسم کی طرح سرخ نظر آئے گا' جیسا کہ سورۃ الرحمٰن کی اس آیت میں بھی بتایا گیا ہے: ﴿فَاِذَا انۡشَقَّتِ السَّمَآءُ فَکَانَتۡ وَرۡدَۃً کَالدِّہَانِ ﴿ۚ۳۷﴾﴾ ''پھر جب آسمان پھٹ جائے گا اور ہو جائے گا گلابی' تیل کی تلچھٹ جیسا۔''

آیت ۱۲ ﴿وَاِذَا الۡجَحِیۡمُ سُعِّرَتۡ ﴿۱۲﴾﴾ ''اور جب جہنّم دہکائی جائے گی۔''

آیت ۱۳ ﴿وَاِذَا الۡجَنَّۃُ اُزۡلِفَتۡ ﴿۱۳﴾﴾ ''اور جب جنّت قریب لے آئی جائے گی۔''

ان تیرہ آیات میں قیامت کے دن کی مختلف کیفیات کا ذکر کرنے کے بعد جو اہم اور اصل بات بتانا مقصود ہے وہ یہ ہے:

آیت ۱۴ ﴿عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّاۤ اَحۡضَرَتۡ ﴿۱۴﴾﴾ ''(اُس دن) ہر جان جان لے گی کہ اُس نے کیا کچھ حاضر کیا ہے۔''

یعنی ہر انسان کے تمام اعمال کی پوری تفصیل اس کے سامنے آجائے گی۔

آیت ۱۵، ۱۶ ﴿فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالۡخُنَّسِ ﴿۱۵﴾ الۡجَوَارِ الۡکُنَّسِ ﴿۱۶﴾﴾ ''تو نہیں! مَیں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹنے والے' چلنے والے اور چھپ جانے والے ستاروں کی۔''

یعنی ایسے ستارے جو سیدھا چلتے چلتے پھر پیچھے ہٹنا شروع ہو جاتے ہیں۔ان آیات کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:

''کئی سیاروں (مثلاً زحل' مشتری' مریخ' زہرہ' عطارد) کی چال اس ڈھب سے ہے کہ کبھی مغرب سے مشرق کو چلیں' یہ سیدھی راہ ہوئی' کبھی ٹھٹک کر الٹے پھریں اور کبھی سورج کے پاس آ کر کتنے دنوں تک غائب رہیں۔''

بہرحال یہ آیات آج کے ماہرینِ فلکیات کو دعوتِ تحقیق دے رہی ہیں کہ وہ جدید معلومات کی روشنی میں ان الفاظ (الْخُنَّس اور الْجَوَارِ الْكُنَّس) کے لغوی معانی کے ساتھ ستاروں کی دنیا کے رموز و حقائق کی مطابقت ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔

آیت ۱۷ ﴿وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ﴿١٧﴾﴾ ''قسم ہے رات کی جب وہ روانہ ہونے لگے۔''

یہ آیت اور سورۃ المدثر کی یہ آیت باہم مشابہ اور ہم معنی ہیں: ﴿وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ﴿٣٣﴾﴾ ''اور قسم ہے رات کی جب کہ وہ پیٹھ موڑے۔''

آیت ۱۸ ﴿وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ﴿١٨﴾﴾ ''اور صبح کی جب وہ سانس لے۔''

یعنی صبح صادق کا وہ وقت جب رات کے سناٹے میں سے زندگی انگڑائی لیتی ہوئی آہستہ آہستہ بیدار ہوتی ہے۔

آیت ۱۹ ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿١٩﴾﴾ ''یقیناً یہ (قرآن) ایک بہت باعزّت پیغامبر کا قول ہے۔''

یہاں ''رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ'' سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ یہ آیت قبل ازیں سورۃ الحاقہ میں بھی (بطور آیت ۴۰) آ چکی ہے اور وہاں ''رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ'' سے مراد محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔سورۃ الحج (آیت ۷۵) میں فرمایا گیا ہے: ﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ﴾ ''اللہ چُن لیتا ہے اپنے پیغامبر فرشتوں میں سے بھی اور انسانوں میں سے بھی''۔ چنانچہ فرشتوں میں سے اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو چُنا اور انسانوں میں سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور یوں ان دو ہستیوں کے ذریعے سے ''رسالت'' کا سلسلہ تکمیل پذیر ہوا۔ زیر مطالعہ آیات میں رسولِ کریم بشر (محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور رسولِ کریم ملک (حضرت جبرائیل علیہ السلام) کی ملاقات کا ذکر بھی آ رہا ہے کہ رسالت کی ان دو کڑیوں کے ملنے کا ثبوت فراہم

ہو جائے۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ النجم میں بھی آ چکا ہے۔

آیت ۲۰ ﴿ذِیۡ قُوَّۃٍ عِنۡدَ ذِی الۡعَرۡشِ مَکِیۡنٍ ﴿۲۰﴾﴾ ’’جو (جبرائیل) بہت قوت والا ہے‘ صاحبِ عرش کے نزدیک بلند مرتبہ ہے۔‘‘

یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے خاص مقربین میں سے ہیں۔

آیت ۲۱ ﴿مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیۡنٍ ﴿۲۱﴾﴾ ’’جس کی اطاعت کی جاتی ہے اور وہ امانت دار بھی ہے۔‘‘

حضرت جبرائیل علیہ السلام تمام فرشتوں کے سردار ہیں۔ اس لحاظ سے آپؑ تمام فرشتوں کے مطاع ہیں یعنی تمام فرشتے آپؑ کی اطاعت کرتے ہیں۔ اور آپؑ امانت دار ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا پیغام جوں کا توں انبیاء و رسل علیہم السلام تک پہنچاتے رہے ہیں۔

آیت ۲۲ ﴿وَ مَا صَاحِبُکُمۡ بِمَجۡنُوۡنٍ ﴿۲۲﴾﴾ ’’اور تمہارے یہ ساتھی (محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کوئی مجنون نہیں ہیں۔‘‘

زیر مطالعہ آیات سورۃ النجم کی ابتدائی آیات کے ساتھ خصوصی مناسبت اور مشابہت رکھتی ہیں۔ وہاں بھی اس مضمون کا آغاز ستارے کی قسم (وَالنَّجۡمِ) سے ہوا ہے اور یہاں بھی اس موضوع پر بات شروع کرنے سے پہلے آیات ۱۵ اور ۱۶ میں ستاروں کی قسمیں کھائی گئی ہیں۔ وہاں صَاحِبُکُمۡ سے بات شروع ہو کر حضرت جبرائیلؑ کے ذکر تک آئی ہے‘ جبکہ یہاں حضرت جبرائیلؑ کا ذکر پہلے اور صَاحِبُکُمۡ کا بیان بعد میں آیا ہے۔ وہاں حضرت جبرائیلؑ کا ذکر شَدِیۡدُ الۡقُوٰی کے لقب سے ہوا ہے جبکہ یہاں انؑ کی شان میں ذِیۡ قُوَّۃٍ کے الفاظ آئے ہیں۔

آیت ۲۳ ﴿وَ لَقَدۡ رَاٰہُ بِالۡاُفُقِ الۡمُبِیۡنِ ﴿۲۳﴾﴾ ’’اور انہوں نے دیکھا ہے اس کو کھلے اُفق پر۔‘‘

یعنی ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے جبریلؑ کو کھلے اور روشن اُفق پر دیکھا ہے‘ اس میں کوئی اشتباہ نہیں ہے۔ بِالۡاُفُقِ الۡمُبِیۡنِ کے لیے سورۃ النجم میں ’بِالۡاُفُقِ الۡاَعۡلٰی‘ (آیت ۷) کی ترکیب آئی ہے۔

آیت ۲۴ ﴿وَ مَا ہُوَ عَلَی الۡغَیۡبِ بِضَنِیۡنٍ ﴿۲۴﴾﴾ ’’اور وہ غیب کے معاملے میں حریص یا بخیل نہیں ہیں۔‘‘

’ضَنِيْنٍ‘ کا ترجمہ حریص بھی کیا گیا ہے اور بخیل بھی۔ دراصل بخل اور حرص دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ایک ہی مفہوم کے دو پہلوؤں کو واضح کرتے ہیں۔ حریص کے معنی میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پوری زندگی تم لوگوں کے سامنے ہے۔ کیا اُنہوںؐ نے کاہنوں اور نجومیوں کے ساتھ کبھی دوستی رکھی ہے؟ یا غیب کی خبریں معلوم کرنے کے لیے کیا انہوںؐ نے کبھی ریاضتیں وغیرہ کرنے کی کوشش کی ہے؟ ظاہر ہے اُنؐ کی زندگی میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ تم لوگ یہ نہیں کہہ سکتے ہو کہ وہ غیب کی خبروں کے معاملے میں شروع ہی سے ''حریص'' تھے۔ اسی طرح وہؐ اس بارے میں بخیل بھی نہیں ہیں اور اس حقیقت کے بھی تم خود گواہ ہو۔ انہیںؐ غیب کی جو خبریں معلوم ہوتی ہیں وہ تم لوگوں کو بتاتے ہیں۔ کیا کاہن اور نجومی بھی غیب کی خبریں اسی طرح کھلے عام لوگوں کو بتاتے ہیں؟ کسی کاہن کے پاس تو غیب کا علم ہوتا ہی نہیں اور جو کسی قیاس آرائی یا ظن و تخمین کی بنا پر وہ کچھ جانتا ہے اس پر وہ اپنا کاروبار چمکاتا ہے۔ گویا ''ہلدی کی گانٹھ'' مل جانے پر وہ پنساری بن کر بیٹھ جاتا ہے اور اپنی ایک ایک بات کے عوض منہ مانگے نذرانے وصول کرتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اگر فرشتے کو دیکھا ہے تو اُنہوںؐ نے سرِ عام تم لوگوں کو بتا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں غیب کا جو علم دیا جا رہا ہے وہؐ مِن و عَن تم لوگوں کو بتاتے ہیں اور اس معاملے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔ (۱)

آیت ۲۵ ﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿۲۵﴾﴾ ''اور یہ کسی شیطانِ مردود کا قول نہیں ہے۔''

شیاطینِ جن چونکہ غیب کے نام پر جھوٹی سچی خبریں کاہنوں تک پہنچاتے رہتے تھے اس لیے یہاں اس امکان کی بھی تردید کر دی گئی ہے۔ یعنی تم لوگ یہ مت سمجھو کہ جِنّوں میں سے کسی شیطان نے انہیںؐ کوئی پٹّی پڑھا دی ہے (معاذ اللہ)۔ یہی مضمون سورۃ الحاقہ میں زیادہ وضاحت اور زیادہ پُرزور انداز میں یوں بیان ہوا ہے: ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾﴾

۱۔ اس آیت پر مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا تفسیری حاشیہ ملاحظہ ہو:

''یعنی یہ پیغمبر ہر قسم کے غیوب کی خبر دیتا ہے' ماضی سے متعلق ہوں یا مستقبل سے' یا اللہ کے اسماء وصفات سے یا احکامِ شرعیہ سے یا مذاہب کی حقیقت و بطلان سے یا جنّت و دوزخ کے احوال سے یا واقعات بعد الموت سے' اور ان چیزوں کے بتلانے میں ذرا بخل نہیں کرتا نہ اجرت مانگتا ہے۔''

’’میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جو تم دیکھتے ہو اور ان کی بھی جو تم نہیں دیکھتے ہو‘‘۔ (یہاں پر مَا تُبۡصِرُوۡنَ سے شاعری وغیرہ مراد ہے‘ اس لیے کہ شاعر لوگ اپنی سوچ اور فکر سے شعر کہتے ہیں‘ جبکہ مَا لَا تُبۡصِرُوۡنَ کے الفاظ میں شیاطین جن کی خبروں کی طرف اشارہ ہے جو وہ کاہنوں تک پہنچاتے تھے)۔ ﴿اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍ ﴿۴۰﴾ وَّمَا هُوَ بِقَوۡلِ شَاعِرٍؕ قَلِيۡلًا مَّا تُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۴۱﴾ وَلَا بِقَوۡلِ كَاهِنٍؕ قَلِيۡلًا مَّا تَذَكَّرُوۡنَ ﴿۴۲﴾﴾ ’’یہ قول ہے رسولِ کریم کا۔ اور یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے۔ کم ہی ہے جو تم یقین کرتے ہو۔ اور نہ ہی یہ کسی کاہن کا کلام ہے۔ کم ہی ہے جو تم غور کرتے ہو۔‘‘

آیت ۲۶ ﴿فَاَيۡنَ تَذۡهَبُوۡنَ ﴿۲۶﴾﴾ ’’تو تم کدھر چلے جا رہے ہو؟‘‘

تمہاری بھلائی اور کامیابی تو اس میں تھی کہ تم لوگ ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) پر ایمان لاتے اور انؐ کی طرف جو وحی آ رہی ہے اس کے نور سے اپنے دلوں کو منور کرتے‘ لیکن تم لوگوں نے اس کے بجائے اُنؐ کی تکذیب اور مخالفت کی روش اپنا رکھی ہے۔ تم لوگ کبھی سنجیدگی سے غور تو کرو کہ اللہ کے کلام سے منہ موڑ کر تم لوگ کس طرف جا رہے ہو۔

آیت ۲۷ ﴿اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۲۷﴾﴾ ’’نہیں ہے یہ مگر تمام جہان والوں کے لیے ایک یاددہانی۔‘‘

قرآن مجید اس مفہوم میں ذکر یعنی یاددہانی ہے کہ یہ انسان کی فطرت میں پہلے سے موجود حقائق کی یاد تازہ کرتا ہے۔ دراصل انسان فطری طور پر اللہ تعالیٰ کی ذات اور توحید کے تصوّر سے آشنا ہے‘ مگر دنیا میں رہتے ہوئے اگر انسان کی فطرت پر غفلت کے پردے پڑ جائیں تو وہ اللہ تعالیٰ کو بھول جاتا ہے۔ سورۃ الحشر کی آیت ۱۹ میں اس حوالے سے ہم اللہ تعالیٰ کا یہ حکم پڑھ چکے ہیں: ﴿وَلَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّذِيۡنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنۡسٰٮهُمۡ اَنۡفُسَهُمۡؕ﴾ کہ اے اہلِ ایمان! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے انہیں اپنے آپ سے ہی غافل کر دیا۔ بہرحال اس غفلت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایمان باللہ سے متعلق وہ حقائق جو ہر انسان کی فطرت میں مضمر ہیں پسِ پردہ چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ قرآنی تعلیمات انسانی فطرت میں موجود ان تمام حقائق کو خفتہ (dormant) حالت سے نکال کر پھر سے فعّال (active) کرنے میں اس کی مدد کرتی ہیں۔

آیت ۲۸ ﴿لِمَنۡ شَآءَ مِنۡكُمۡ اَنۡ یَّسۡتَقِیۡمَ ﴿۲۸﴾﴾ ’’ہر اُس شخص کے لیے جو تم میں سے سیدھے راستے پر چلنا چاہے۔‘‘

یعنی قرآن ہر اُس شخص کے لیے یاد دہانی ہے جو ہدایت کا طالب ہو اور پورے خلوص سے چاہتا ہو کہ وہ گمراہی سے نکل کر ہدایت کے راستے پر آ جائے۔

آیت ۲۹ ﴿وَ مَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۲۹﴾﴾ ’’اور تمہارے چاہے بھی کچھ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اللہ نہ چاہے جو تمام جہانوں کا ربّ ہے۔‘‘

یہ مضمون قرآن مجید میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے‘ یعنی کسی انسان کو ہدایت تبھی ملے گی جب وہ خود بھی اس کے لیے ارادہ کرے اور پھر اللہ بھی اسے ہدایت دینا چاہے۔ ظاہر ہے ہر کام اللہ ہی کے اذن اور اسی کی توفیق سے ہوتا ہے۔ لیکن ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کی توفیق کے ساتھ انسان کی اپنی خواہش اور طلب کا شامل ہونا بہت ضروری ہے‘ کیونکہ اللہ تعالیٰ زبردستی کسی پر ہدایت مسلط نہیں کرتا۔ اگر ایسا ہو تو پھر سزا اور جزا کا سارا فلسفہ ہی غلط ہو جاتا ہے۔ ۞

سُوۡرَۃُ الۡاِنۡفِطَارِ

تمہیدی کلمات

سورۃ الانفطار اور سورۃ التکویر کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے اور یہ تعلق اس حد تک گہرا ہے کہ ان دونوں کا مضمون بھی ایک ہے‘ بلکہ متعلقہ مضمون دونوں سورتوں کے ملنے سے مکمل ہوتا ہے۔ دونوں سورتوں کی ابتدائی آیات میں قیامت کے حالات کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ سورۃ التکویر میں ان حالات کی تفصیل تیرہ آیات میں بیان ہوئی ہے جبکہ سورۃ الانفطار میں وہی مضمون صرف چار آیات میں سمٹ گیا ہے۔ اس مضمون کے بعد سورۃ التکویر میں جو اہم خبر دی گئی ہے وہ یہ ہے: ﴿عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّاۤ اَحۡضَرَتۡ ﴿۱۴﴾﴾ جبکہ سورۃ الانفطار میں اس کے مقابلے یہ آیت آئی ہے: ﴿عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ وَ اَخَّرَتۡ ﴿۵﴾﴾۔ یہاں تک تو دونوں سورتوں کا مضمون ایک جیسا ہے۔ اس کے بعد سورۃ التکویر میں قرآن مجید کی صداقت کا حوالہ دے کر مخاطبین سے یہ چبھتا ہوا

سوال کیا گیا ہے: ﴿فَاَیۡنَ تَذۡهَبُوۡنَ ﴿۲۶﴾﴾ کہ تم لوگ نہ اللہ کے رسولؐ کی سیرت کو دیکھتے ہو‘ نہ حق کو پہچاننے کی زحمت گوارا کرتے ہو۔ آخر تم لوگ جا کدھر رہے ہو؟ لیکن وہاں یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ جب قیامت برپا ہو جائے گی اور ہر شخص کو اس کے اعمال کی تفصیل سے آگاہ کر دیا جائے گا تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ چنانچہ اس موضوع پر روشنی یہاں سورۃ الانفطار میں ڈالی گئی ہے کہ اگر یہ راستہ اختیار کرو گے تو اس منزل پر پہنچو گے اور اگر دوسرا طرزِ عمل اپناؤ گے تو اس انجام سے دوچار ہو گے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ ۙ﴿۱﴾ وَ اِذَا الۡکَوَاکِبُ انۡتَثَرَتۡ ۙ﴿۲﴾ وَ اِذَا الۡبِحَارُ
فُجِّرَتۡ ۙ﴿۳﴾ وَ اِذَا الۡقُبُوۡرُ بُعۡثِرَتۡ ۙ﴿۴﴾ عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ وَ
اَخَّرَتۡ ؕ﴿۵﴾ یٰۤاَیُّهَا الۡاِنۡسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الۡکَرِیۡمِ ۙ﴿۶﴾ الَّذِیۡ
خَلَقَکَ فَسَوّٰىکَ فَعَدَلَکَ ۙ﴿۷﴾ فِیۡۤ اَیِّ صُوۡرَةٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ ؕ﴿۸﴾ کَلَّا
بَلۡ تُکَذِّبُوۡنَ بِالدِّیۡنِ ۙ﴿۹﴾ وَ اِنَّ عَلَیۡکُمۡ لَحٰفِظِیۡنَ ۙ﴿۱۰﴾ کِرَامًا
کَاتِبِیۡنَ ۙ﴿۱۱﴾ یَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿۱۲﴾ اِنَّ الۡاَبۡرَارَ لَفِیۡ نَعِیۡمٍ ﴿ۚ۱۳﴾ وَ
اِنَّ الۡفُجَّارَ لَفِیۡ جَحِیۡمٍ ﴿ۚۖ۱۴﴾ یَّصۡلَوۡنَهَا یَوۡمَ الدِّیۡنِ ﴿۱۵﴾ وَ مَا هُمۡ
عَنۡهَا بِغَآئِبِیۡنَ ؕ﴿۱۶﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ ۙ﴿۱۷﴾ ثُمَّ مَاۤ
اَدۡرٰىکَ مَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ ؕ﴿۱۸﴾ یَوۡمَ لَا تَمۡلِکُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَیۡـًٔا ؕ
وَ الۡاَمۡرُ یَوۡمَئِذٍ لِّلّٰهِ ﴿ع۱۹﴾

آیت ۱ ﴿اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ ﴿۱﴾﴾ ”جب آسمان پھٹ جائے گا۔“

آیت ۲ ﴿وَاِذَا الۡکَوَاکِبُ انۡتَثَرَتۡ ﴿۲﴾﴾ ”اور جب تارے بکھر جائیں گے۔“

آیت ۳ ﴿وَاِذَا الۡبِحَارُ فُجِّرَتۡ ﴿۳﴾﴾ ”اور جب سمندر پھاڑ دیے جائیں گے۔“

آیت ۴ ﴿وَاِذَا الۡقُبُوۡرُ بُعۡثِرَتۡ ﴿۴﴾﴾ ”اور جب قبریں تلپٹ کر دی جائیں گی۔“

آیت ۵ ﴿عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ وَاَخَّرَتۡ ﴿۵﴾﴾ ”(اُس وقت) ہر جان‘ جان لے

گی کہ اُس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔‘‘

اُس دن ہر شخص کو واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ اُس نے کیا کیا اچھے یا بُرے اعمال آگے بھیجے تھے اور ان کے آثار و نتائج کی شکل میں کیا کچھ وہ اپنے پیچھے دنیا میں چھوڑ آیا تھا۔ اس مضمون کی وضاحت قبل ازیں سورۃ القیامہ کی آیت ۱۳ کے تحت بھی کی جا چکی ہے۔ اس کے علاوہ اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ قیامت کے دن ہر انسان کو بتا دیا جائے گا کہ اس نے کس شے کو آگے کیا تھا اور کس شے کو پیچھے رکھا تھا۔ یعنی دنیا اور آخرت میں سے اس نے کس کو مقدم رکھا تھا اور کس کو مؤخر کیا تھا۔ آیت کے اس مفہوم سے واضح ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کسی انسان کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار کُلّی طور پر اس ’’طرزِ عمل‘‘ پر ہے جو وہ اپنی زندگی میں دنیا اور آخرت کے بارے میں اختیار کرتا ہے۔ یعنی انسان کا ایک طرزِ عمل یہ ہو سکتا ہے کہ میرا اصل مطلوب و مقصود تو آخرت ہے‘ دنیا کا کیا ہے جو مل گیا وہی غنیمت ہے اور اگر کبھی نہ بھی ملے تب بھی کوئی بات نہیں۔ دوسرا ممکنہ رویہ یہ ہے کہ میرا اصل مقصود تو دنیا ہے‘ اس کے ساتھ ساتھ اگر آخرت بھی مل جائے تو اچھا ہے‘ چاہے وہ کسی کی سفارش سے مل جائے یا کسی اور حیلے سے۔ لیکن میری پہلی ترجیح بہرحال دنیا اور اس کا مال و متاع ہے‘ اور زندگی میں میری ساری تگ و دو اسی کے لیے ہے۔

آیت ۶ ﴿یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ ۝۶﴾ ’’اے انسان! تجھے کس چیز نے دھوکے میں ڈال دیا ہے اپنے ربّ کریم کے بارے میں۔‘‘

ظاہر ہے یہ کام شیطان لعین ہی کرتا ہے۔ وہی انسان کو اللہ تعالیٰ کے بارے میں دھوکے میں ڈالتا ہے۔ اس حوالے سے قرآن مجید میں بنی نوع انسان کو بار بار خبردار کیا گیا ہے‘ مثلاً سورۂ لقمان میں فرمایا: ﴿وَلَا یَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝۳۳﴾ کہ وہ بڑا دھوکے باز تم لوگوں کو اللہ کے بارے میں کہیں دھوکے میں مبتلا نہ کر دے! لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام تر تنبیہات کے باوجود اکثر انسان شیطان کے اس جال میں پھنس جاتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے شیطان مختلف لوگوں کے ساتھ مختلف چالیں اور حربے آزماتا ہے۔ مثلاً ایک دیندار شخص کو اہم فرائض سے ہٹانے کے لیے وہ نوافل اور ذکر واذکار کا پُرکشش پیکج پیش کر سکتا ہے کہ تم اقامتِ دین اور دوسرے فرائضِ دینی کا خیال چھوڑ دو اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے راتوں کو جاگنے اور تہجد کی پابندی پر توجّہ دو۔ عام مسلمانوں کے لیے اس کی بہت ہی تیر بہدف چال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ غفورٌ

رحیم ہے‘ وہ کوئی خردہ گیر نہیں کہ اپنے مؤمن بندوں کو چھوٹی چھوٹی خطاؤں پر پکڑے۔ وہ تو بہت بڑے بڑے گناہگاروں کو بھی معاف کر دیتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں بے عملی کی سب سے بڑی وجہ شیطان کی یہی چال ہے‘ بلکہ اس دلیل کے سہارے اکثر لوگ گناہوں کے بارے میں حیران کن حد تک جری اور بے باک ہو جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے آیت زیر مطالعہ ہم میں سے ہر ایک کو دعوتِ فکر دے رہی ہے کہ اے اللہ کے بندے! تمہاری بے عملی کی وجہ کہیں یہ تو نہیں ہے کہ شیطان نے تمہیں اللہ تعالیٰ کی شانِ غفاری کے نام پر دھوکے میں مبتلا کر دیا ہے؟

آیت ۷ ﴿الَّذِیۡ خَلَقَکَ فَسَوّٰىکَ فَعَدَلَکَ ۙ﴿۷﴾﴾ ’’جس نے تمہیں تخلیق کیا‘ پھر تمہارے نوک پلک سنوارے‘ پھر تمہارے اندر اعتدال پیدا کیا۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے تمہارے قوائے جسمانی اور قوائے نفسیاتی میں ہر طرح سے اعتدال اور توازن پیدا کیا ہے۔ گویا تمہاری تخلیق اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کی مظہر ہے۔ تمہاری تخلیق کے اندر توازن اور خوبصورتی کا یہ پہلو گویا اس حقیقت پر گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر معاملے میں عدل و اعتدال کو پسند فرماتا ہے اور یہ کہ وہ تم انسانوں کے ساتھ آخرت میں بھی عدل و انصاف کا معاملہ فرمائے گا‘ تاکہ گناہگاروں کو قرار واقعی سزا مل سکے اور نیکوکار اپنی نیکیوں کا پورا پورا بدلہ پائیں۔ تمہاری مبنی بر اعتدال تخلیق و ترکیب کا تقاضا تو یہ تھا کہ تمہارے خیالات و اعمال بھی اعتدال اور توازن کا مظہر ہوتے‘ مگر تم لوگ ہو کہ اپنے خالق کے بارے میں ہی دھوکے میں مبتلا ہو گئے ہو۔ تم اس کی شانِ غفاری کو تو بہت اہتمام سے یاد رکھتے ہو جبکہ اس کی صفتِ عدل سمیت بہت سی دوسری صفات کو بالکل ہی بھولے ہوئے ہو۔ تمہاری یہ بے اعتدالی تمہارے اس خالق کو بالکل پسند نہیں ہے جس نے تمہاری تخلیق کا خمیر ہی اعتدال سے اٹھایا ہے۔

آیت ۸ ﴿فِیۡۤ اَیِّ صُوۡرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ ؕ﴿۸﴾﴾ ’’پھر جس شکل میں اُس نے چاہا تجھے ترکیب دے دیا۔‘‘

اللہ تعالیٰ ہر انسان کی شکل اور اس کے مختلف اعضاء اپنی مرضی و مشیت کے مطابق بناتا ہے۔ ظاہر ہے اس معاملے میں کسی انسان کو کوئی اختیار نہیں۔ اس موضوع کی مناسبت سے مجھے حضرت حسّان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے نعتیہ اشعار یاد آ گئے ہیں۔ آپؓ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شان میں فرماتے ہیں:

وَاَحْسَنُ مِنْکَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَیْنِیْ
وَاَجْمَلُ مِنْکَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ
خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِنْ کُلِّ عَیْبٍ
کَاَنَّکَ قَدْ خُلِقْتَ کَمَا تَشَاءُ

’’آپ ﷺ سے زیادہ حسین میری آنکھ نے کبھی نہیں دیکھا اور آپؐ سے بڑھ کر جمیل عورتوں نے جنا ہی نہیں۔ آپؐ ہر عیب اور نقص سے مبرّا پیدا ہوئے ہیں۔ گویا آپؐ اس طرح پیدا ہوئے ہیں جس طرح آپؐ نے خود چاہا۔‘‘

آیت ۹ ﴿كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۝۹﴾ ’’ہرگز نہیں! بلکہ اصل میں تم جزا و سزا کا انکار کر رہے ہو۔‘‘

تم لوگ یہ جو اللہ تعالیٰ کی شانِ غفاری کے قصیدے پڑھ رہے ہو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم اس کی رحمت اور بخشش پر واقعتاً بہت پختہ یقین بھی رکھتے ہو‘ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اپنے اس فلسفے کی آڑ میں تم جزا و سزا کا انکار کرنا چاہتے ہو۔ اسی طرح کے ایک ’’قصیدے‘‘ کی یہ جھلک ملاحظہ کیجیے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور شانِ غفاری کا اقرار ہے یا اس کے فلسفہ جزا و سزا کا مذاق: ؎

عصیاں سے کبھی ہم نے کنارا نہ کیا
پر تُو نے دل آزردہ ہمارا نہ کیا
ہم نے تو جہنّم کی بہت کی تدبیر
لیکن تیری رحمت نے گوارا نہ کیا!

اگر کوئی شخص واقعی پوری دیدہ دلیری سے جہنّم کی تدبیر اور کوشش کر رہا ہے تو اللہ تعالیٰ کے عدل کا تقاضا تو یہی ہے کہ اس کی خواہش پوری کرتے ہوئے اسے جہنّم میں جھونک دیا جائے۔ چنانچہ ایسے خیالات و نظریات کے حامل لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور شانِ غفاری کی مَن مانی تشریح کر کے نہ صرف اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں‘ بلکہ عملی طور پر جزا و سزا کے فلسفہ کا ہی انکار کر رہے ہیں۔

آیت ۱۰ ﴿وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝۱۰﴾ ’’حالانکہ تم پر نگران (فرشتے) مقرر ہیں۔‘‘

آیت ۱۱ ﴿كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ﴿۱۱﴾﴾ ''جو بڑے باعزّت لکھنے والے ہیں۔''

آیت ۱۲ ﴿يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۱۲﴾﴾ ''وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کر رہے ہو۔''

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے بطور نگران مقرر کر رکھے ہیں جو اُس کا ایک ایک عمل لکھ رہے ہیں۔ اب اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو انسانوں کا محاسبہ کرنا منظور نہیں ہے تو گویا وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اس کا فرشتوں کو بطور نگران مقرر کرنا اور ان فرشتوں کا ایک ایک انسان کے ایک ایک عمل کا ریکارڈ مرتّب کرنا سب کارِ عبث ہے۔ ایسے خیالات کے حامل لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ''کارِ عبث'' اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں' وہ احتساب ضرور کرے گا اور اس احتساب کے نتائج بھی ضرور نکلیں گے' جن کا ذکر اگلی آیات میں ہے:

آیت ۱۳ ﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿۱۳﴾﴾ ''یقیناً نیکوکار بندے نعمتوں میں ہوں گے۔''

آیت ۱۴ ﴿وَّاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ﴿۱۴﴾﴾ ''اور یقیناً فاسق وفاجر جہنّم میں ہوں گے۔''

آیت ۱۵ ﴿يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿۱۵﴾﴾ ''داخل ہوں گے اس میں جزاوسزا کے فیصلے کے دن۔''

آیت ۱۶ ﴿وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ﴿۱۶﴾﴾ ''اور وہ اس سے کہیں غائب نہیں ہو سکیں گے۔''

ظاہر ہے جہنّم سے بھاگ نکلنے کا نہ کوئی راستہ ہوگا اور نہ ہی کسی میں بھاگ جانے کی طاقت ہوگی۔

آیت ۱۷ ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۷﴾﴾ ''اور کیا تمہیں کچھ معلوم ہے کہ روزِ جزا کیا ہے؟''

آیت ۱۸ ﴿ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۸﴾﴾ ''پھر کیا تمہیں کچھ اندازہ ہوا ہے کہ روزِ جزا کیا ہے؟''

آیت ۱۹ ﴿يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۭ﴾ ''جس روز کسی جان کو کسی دوسری جان کے لیے کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا۔''

﴿وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ﴿۱۹﴾﴾ ''اور امرِ کُل کا کُل اس دن اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوگا۔''

(باقی صفحہ 46 پر)

ارضِ فلسطین
تاریخی پس منظر اور ہولناک مستقبل

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

ڈیڑھ سو برس تک فلسطین یہودیوں سے خالی رہا۔ اس کے بعد ایران کا بادشاہ سائرس منظر عام پر آیا' جس نے عراق پر حملہ کر کے نمرود کو شکست دی اور یہود کو واپس جانے کی اجازت دے دی۔ اس وقت حضرت عزیر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تجدیدی و اصلاحی تحریک کے ذریعے بنی اسرائیل کی تطہیر (purgation) کی گئی اور مشرکانہ اعمال سے ان کو پاک کیا گیا۔ معبد سلیمانی کو انہوں نے دوبارہ تعمیر کیا اور اسے ''معبد ثانی'' (Second Temple) کا نام دیا۔ اس کے بعد ان پر یونانی حملہ آور ہوئے۔ سکندر اعظم یہیں سے گزر کر انہیں تہس نہس کرتا ہوا پنجاب تک آیا اور اس کے سپہ سالار سلیوکس کی ان پر حکومت رہی۔ کچھ عرصے بعد رومیوں نے یہاں پر حکومت قائم کر لی۔ البتہ انہوں نے براہِ راست قبضہ نہیں کیا بلکہ وہاں پر مقامی بادشاہتیں رہنے دیں۔ بہرحال اس زمانے میں ایک عظیم مکابی سلطنت قائم ہوئی' جس نے ۱۷۰ ق م سے ۶۳ ق م تک پھر بالکل وہی نقشہ دکھا دیا جو حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے زمانے کا تھا۔ یہ سو برس ایسے ہیں کہ پورے فلسطین پر یہودیوں کا قبضہ رہا۔ پھر ان کے اندر زوال آیا اور اللہ تعالیٰ نے رومیوں کو ان پر مسلّط کیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام اس زمانے میں مبعوث کیے گئے۔ یہودیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کا کفر کیا۔ انہیں ۳۳ یا ۳۴ عیسوی میں اللہ تعالیٰ نے آسمان پر اٹھا لیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہود کو یوں سزا دی کہ ۷۰ء میں ایک رومن جنرل ٹائٹس نے ان پر حملہ کیا اور یروشلم کی دوبارہ اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ سیکنڈ ٹیمپل گرا دیا گیا۔ ۷۰ء سے آج ۲۰۰۴ء تک ۱۹۳۴ء برس

سے یہودیوں کا خانہ کعبہ گرا ہوا ہے۔ ٹائٹس نے ایک دن میں ایک لاکھ ۳۳ ہزار یہودی یروشلم میں قتل کیے اور ۶۶ ہزار کو وہ قیدی بنا کر یورپ لے گیا۔ یہودیوں کو فلسطین سے نکلنے کا حکم دے دیا گیا۔ ۱۹۱۷ء تک یہودی فلسطین سے بے دخل رہے ہیں۔

یہ ساری داستان میں نے آپ کو اس لیے بتائی ہے کہ یہودی کہتے ہیں کہ فلسطین کی سرزمین اللہ نے ہمیں دی ہے اور اس پر ہمارا پیدائشی حق ہے۔ آج بدقسمتی سے لبرل مسلمان‘ یہاں تک کہ میں حیران ہوں کہ بعض وسیع النظر علماء بھی ان کے اس دعوے کو تسلیم کر رہے ہیں۔ اس کے لیے قرآن کے ان الفاظ کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ ﴿... الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمْ ...﴾ (المائدۃ:۲۱) ’’وہ ارضِ مقدس جو تمہارے لیے لکھ دی گئی ہے۔‘‘ لیکن اُس وقت یہ چیز اس سے مشروط تھی کہ اگر جہاد کر کے فتح کر لو گے تو یہ تمہاری ہوگی۔ جب انہوں نے جہاد و قتال نہیں کیا تو یہ وعدہ ختم ہو گیا۔ بہرحال یہاں پر ان کا حق نہیں ہے۔ وہ دو ہزار سال پہلے نکال دیے گئے تھے۔ پوری دنیا میں ان سے شدید نفرت کی جاتی تھی۔ عیسائی یورپ کے اندر انہیں ستایا اور مارا جاتا تھا۔ ان کو شہروں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کی بستیاں شہروں سے باہر ہوتی تھیں‘ صرف دو گھنٹے کا وقت مقرر تھا کہ ضروریاتِ زندگی کی خرید و فروخت کے لیے آ جا سکتے ہو۔ یہ حال تھا ان کا!

فلسطین پر یہودیوں کے دعوے میں عیسائیوں کا بھی ایک بہت بڑا اور مؤثّر حلقہ ان کے ساتھ ہے۔ عیسائیوں کو دو فرقوں یعنی کیتھولکس اور پروٹسٹنٹس میں تقسیم کرنے والے بھی یہودی تھے‘ ورنہ پہلے سب عیسائی ایک پوپ کو ماننے والے تھے۔ پوپ کے خلاف بغاوت یہودیوں نے کروائی اور سب سے پہلے اس کا ظہور انگلستان میں ہوا۔ انگریزوں نے اپنا چرچ ’’چرچ آف انگلینڈ‘‘ کے نام سے علیحدہ کر لیا‘ جو پوپ کے تحت نہیں تھا۔ سب سے پہلا پروٹسٹنٹ ملک بھی برطانیہ تھا اور وہیں پر یہودیوں نے سب سے پہلا ’’بینک آف انگلینڈ‘‘ قائم کیا تھا۔ اس سے پہلے دنیا میں کوئی بینک نہیں تھا‘ کوئی سودی معاملہ نہیں تھا۔ پوپ کے زیر اثر کسی بھی علاقے میں سود کی اجازت نہیں تھی۔ یوں

پروٹسٹنٹس یہودیوں کے آلۂ کار بن گئے۔ سو سال پہلے تک پروٹسٹنٹس کا امام برطانیہ تھا‘ لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد سے یہ جگہ امریکہ نے لے لی ہے۔

عیسائیوں کا معاملہ یہ ہے کہ ارضِ فلسطین سے ان کا بھی تعلق ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جہاں پیدا ہوئے‘ وہ مقام بیت اللحم ہی تھا۔ پھر جہاں انہوں نے تبلیغ کی‘ وہ سارا علاقہ فلسطین ہی کا تو ہے۔ عیسائیوں کے قول کے مطابق اسی یروشلم شہر کے اندر انہیں صلیب دی گئی۔ تو عیسائیوں کی نظر میں فلسطین مذہبی اعتبار سے ان کا اہم ترین اور مقدّس ترین علاقہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے ایک ہزار سال بعد انہوں نے ارضِ مقدّس کو مسلمانوں کے قبضے سے واگزار کرانے کے لیے صلیبی جنگیں (crusades) شروع کیں۔ ان کروسیڈز کے اندر انتہائی خون ریزی ہوئی اور بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں میں مسلمانوں کی اکثر بستیاں تباہ و برباد ہوگئیں۔ ۱۰۹۹ء میں عیسائیوں نے یروشلم فتح کر لیا اور وہاں لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا۔ یورپی مؤرخین لکھتے ہیں کہ جب عیسائی فاتحین کے گھوڑے یروشلم میں داخل ہوئے تو ان گھوڑوں کے گھٹنوں تک خون کا دریا بہ رہا تھا۔ مسلمانوں پر ایسا عذاب آیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اٹھاسی سال بعد ۱۱۸۷ء میں اُس نے ایک مردِ مجاہد صلاح الدین ایوبیؒ کو اٹھایا۔ انہوں نے عیسائیوں کو شکست دی اور یروشلم واپس لے لیا۔ اس کے بعد بھی تین چار کوششیں ہوئی ہیں۔ کروسیڈز ایک دفعہ نہیں بلکہ کئی دفعہ ہوئی ہیں۔ تاہم‘ اب امریکہ کے پروٹسٹنٹ عیسائی کہہ رہے ہیں کہ فیصلہ کن صلیبی جنگ شروع ہونے والی ہے‘ جب مسلمانوں کے ایک ایک بچے کو فلسطین سے نکال دیا جائے گا اور یہ زمین پاک کر دی جائے گی۔ The Philadelphia Trumpet کی اشاعت بابت اگست ۲۰۰۱ء میں اس کے ایڈیٹر کی طرف سے یہ عبارت شائع ہوئی ہے:

> *"Most people think the crusades are a thing of the past over forever. But they are wrong. Preperations are being made for a final crusade, and it will be the bloodiest of all! (Gerald Flurry)"*

’’اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ صلیبی جنگ ماضی کی بات ہے جو ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی۔ لیکن وہ غلط سمجھتے ہیں۔ آخری صلیبی جنگ کے لیے تیاریاں ہو رہی ہیں اور وہ سب سے زیادہ خون ریز ہو گی!‘‘

اب مستقبل کیا ہے؟ آئندہ کے حالات سامنے آ گئے ہیں۔ ۷۰ء سے نکالے ہوئے یہودی جن کی انتہائی تعذیب (persecution) ہوئی ہے — پہلے کروسیڈز میں جہاں مسلمانوں کا قتل عام ہوا ہے‘ اس کے برابر یہودیوں کا بھی ہوا ہے‘ کیونکہ عیسائیوں کو یہودیوں سے بھی شدید نفرت تھی۔ ایک قوم (عیسائی) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتی ہے جبکہ دوسری (یہود) انہیں حرام زادہ‘ واجب القتل‘ کافر اور مرتد ٹھہراتی ہے (نعوذ باللہ)۔ تو ان دونوں قوموں میں کوئی مصالحت کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ تاریخ کا معجزہ ہے۔ یہ یہودیوں کی محنت‘ جدّ و جُہد‘ کوشش‘ سازشی انداز‘ منصوبہ بندی اور دور اندیشی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے عیسائیوں کو‘ جو یہودیوں کے خون کے پیاسے تھے اور ان سے انتہائی نفرت کرتے تھے‘ رفتہ رفتہ دو فرقوں میں تقسیم کر دیا۔ پروٹسٹنٹس کو انہوں نے اپنا آلۂ کار بنایا اور آج پوری عیسائی دنیا ان کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ یہودیوں کا ایجنڈا کیا ہے؟ ’’آرمیگاڈان‘‘ کی ایک خبر دی گئی ہے کہ بہت بڑی جنگ ہو گی۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہ جلد از جلد ہو جائے‘ جس کی حدیث میں بھی خبر ہے ’’الملحمۃ الکبریٰ‘‘۔ تاریخ انسانی کی یہ سب سے بڑی جنگ کئی سالوں پر پھیلی ہو گی۔ یہ جنگ اگرچہ چھوٹے سے علاقے میں ہو گی‘ لیکن خون ریزی کے اعتبار سے دنیا کی تاریخ کی کوئی جنگ اس کے مساوی نہیں ہو گی۔ چنانچہ یہود چاہتے ہیں کہ پہلے تو آرمیگاڈان کے نتیجے میں گریٹر اسرائیل قائم ہو جائے۔ اس کے لیے کوشش ہو رہی ہے۔

ذرا سوچیے کہ امریکہ نے عراق پر کیوں حملہ کیا! ابھی تک کوئی وجہ سامنے نہیں آ سکی۔ کوئی وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار برآمد نہیں ہوئے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ تیل کے لیے کیا گیا۔ قطعاً نہیں! یہ گریٹر اسرائیل کی طرف پہلا قدم ہے۔ ۱۹۹۱ء کی خلیجی جنگ کے اتحادی کمانڈر انچیف نے بعد میں صاف کہہ دیا تھا کہ ’’ہم نے

اسرائیل کی حفاظت کے لیے جنگ کی۔'' یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ ہم نے گریٹر اسرائیل بنانا ہے۔ پہلے کہتے تھے کہ فرات تک ہمارا علاقہ ہے‘ اب کہتے ہیں دریائے دجلہ بھی ہمارا ہے۔ سقوطِ بغداد کے وقت اسرائیلی وزیراعظم شیرون نے صاف کہہ دیا تھا کہ عنقریب عراق پر ہمارا قبضہ ہوگا۔ یہ ساری تیاری اس کے لیے ہے۔ یہ یہودی ہیں جو بش اور اس کے ساتھیوں کو چابی دے رہے ہیں۔ یہ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کا واقعہ کرنے والے بھی یہودی ہیں۔ امریکہ میں اب اس بارے میں کوئی تحقیق نہیں ہورہی کہ نائن الیون کا واقعہ کس نے کیا تھا! شروع میں کچھ کارروائی ہوئی تھی‘ لیکن اس کی بعض باتیں لیک ہونے پر معاملہ فوراً ٹھپ کر دیا گیا‘ کیونکہ وہ کُھرا تو اسرائیل تک پہنچ رہا تھا۔ بہرحال یہودیوں کا ایجنڈا یہ ہے کہ سب سے پہلے آرمیگاڈان جلد از جلد ہو جائے جس کے نتیجے میں گریٹر اسرائیل قائم ہو۔ وہاں پر وہ اپنا تھرڈ ٹمپل تعمیر کریں گے‘ جس کے لیے مسجد اقصیٰ اور گنبد صخرہ (Dome of the Rock) دونوں کو گرایا جائے گا۔ پھر وہاں پر تختِ داؤدی لا کر رکھا جائے گا اور اس پر وہ ''مسیحا'' آ کر بیٹھے گا جس کا انہیں انتظار ہے۔

پروٹسٹنٹ عیسائی بھی یہی کہتے ہیں کہ آرمیگاڈان جنگ جلد ہو‘ گریٹر اسرائیل قائم ہو اور تھرڈ ٹمپل بنے۔ پروٹسٹنٹ عیسائیوں اور کیتھولکس کے درمیان مذہب کے نام پر جتنی خون ریزی ہوئی ہے‘ دنیا میں کبھی نہیں ہوئی۔ یورپ میں اس پر جس قدر خانہ جنگیاں ہوئی ہیں‘ اس کا آپ تصوّر نہیں کر سکتے۔ سارے پروٹسٹنٹس یہاں سے مار مار کر بھگا دیے گئے‘ جو امریکہ میں جا کر آباد ہوئے۔ یورپ کا بڑا حصہ کیتھولکس پر مشتمل ہے۔ سپین‘ اٹلی‘ فرانس‘ جرمنی سب کیتھولکس ہیں۔ پروٹسٹنٹس نے امریکہ کے اندر اپنی نئی دنیا بسائی ہے اور وہاں وہ غالب ہیں۔ یہودی اور پروٹسٹنٹ عیسائی برطانیہ اور امریکہ کو نیا اسرائیل کہتے ہیں‘ اس لیے کہ یہاں انہیں طاقت اور کنٹرول حاصل ہے۔ بہرحال کیتھولکس کی چونکہ پروٹسٹنٹس کے ساتھ دشمنی ہے اس لیے درحقیقت اب یورپ میں آخری صلیبی جنگ کی تیاری ہو رہی ہے۔ یورپ کو دوبارہ متحد کیا جا رہا ہے‘ جیسے کبھی رومن ایمپائر ہوتی تھی اور پورا یورپ تقریباً ایک بادشاہ کے تحت ہوتا۔ یہ اصل میں پوپ کی طرف سے کروایا جا رہا ہے تاکہ بہت بڑی

رومن کیتھولک ایمپائر قائم ہو سکے۔ نیٹو سے علیحدہ ہو کر یورپ کی اپنی الگ فوج بنانے کی تیاریاں بھی اسی منصوبے کا حصہ ہیں۔ پروٹسٹنٹس کا کہنا یہ ہے کہ کیتھولک عیسائی فلسطین کو فتح کرنا چاہتے ہیں' تاکہ یہودیوں اور مسلمانوں کو ختم کر کے وہاں پر کیتھولک عیسائی ریاست قائم ہو جائے۔

سابقہ اُمّتِ مُسلمہ بنی اسرائیل جن کو اللہ تعالیٰ نے کتابِ ہدایت اور کتابِ شریعت تورات عطا کی تھی' تقریباً دو ہزار برس تک اس دنیا میں اللہ کی نمائندہ قوم کے منصب پر فائز رہی۔ انہیں ۱۴۰۰ قبل مسیح میں تورات عطا کی گئی تھی اور ۶۱۰ عیسوی میں آنحضورﷺ کی بعثت تک وہ اُمّتِ مُسلمہ تھے۔ ۶۲۴ء میں تحویل قبلہ کا حکم اس امر کی واضح علامت اور اعلان تھا کہ سابقہ اُمّتِ مُسلمہ' جس کا مرکز بیت المقدس تھا' اب اپنی اس حیثیت سے معزول کر دی گئی ہے اور جونئی اُمّت اس مقام پر فائز کی گئی ہے یعنی اُمّتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام' اس کا مرکز خانہ کعبہ ہے۔ حضورِ اکرمﷺ کی بعثت تک بنی اسرائیل کی دو ہزار سالہ تاریخ تھی جبکہ تقریباً ساڑھے چودہ سو برس اس اُمّتِ محمدؐ کے ہیں۔ اس پس منظر میں فلسطین کے حوالے سے ایک بڑا پیارا جملہ میری نظر سے گزرا تھا کہ:

Too small geography but too big a history

یعنی فلسطین جغرافیہ کے اعتبار سے تو بہت چھوٹی جگہ ہے' اس کا رقبہ ہماری سابقہ ریاست بہاول پور کے برابر ہے' لیکن تاریخ اس کی پانچ ہزار سال تک پہنچی ہوئی ہے۔ اس کے مانند دنیا کے کسی علاقے کی تاریخ محفوظ نہیں ہے۔ اس کا آغاز آج سے چار ہزار سال قبل انبیاء کرام علیہم السلام کے سلسلے سے ہوتا ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق سے ہجرت کر کے فلسطین میں آئے تھے۔ ان کی قوم کی طرف سے دشمنی کی انتہا یہ تھی کہ آگ میں ڈال دیے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے آگ کو حکم دیا تو وہ گل وگلزار بن گئی۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ اب میں یہاں سے ہجرت کر جاؤں گا۔ یہ اللہ کا قانون رہا ہے کہ جب کسی قوم کی طرف کوئی رسول بھیجا جائے اور وہ قوم اس رسول کی جان لینے پر آمادہ ہو جائے تو پھر اسے ہجرت کی اجازت ہو جاتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا تھا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فلسطین کو اپنا مسکن اور مرکز بنا لیا۔ ان کے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام کا مقام بھی یہیں رہا۔ پھر ان کے بیٹے یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی یہیں قیام کیا۔ ان تین انبیاء کے تسلسل کے ساتھ وہاں قیام کو بھی بنی اسرائیل اپنی تاریخ کا حصہ سمجھتے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل مصر چلے گئے اور چار پانچ سو سال تک وہاں رہے۔ اس دوران فلسطین کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ بنی اسرائیل کے لیے یہ شدید ترین غلامی اور تعذیب کا دور تھا' جس سے انہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے سے نجات دلائی۔ پانچ چھ سو سال قبل محض ستّر افراد کا جو قافلہ مصر میں داخل ہوا تھا' اب اس کی تعداد چھ لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ وہاں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اس قافلے کو لے کر فلسطین کی سرحد پر پہنچ گئے اور اپنی قوم کو حکم دیا کہ اب جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ اور اِس ارضِ مقدس میں داخل ہو جاؤ۔ لیکن پوری قوم نے کورا جواب دے دیا۔ قرآن مجید میں (سورۃ المائدۃ) ارشاد ہے: ﴿اِنَّا لَنۡ نَّدۡخُلَهَاۤ اَبَدًا مَّا دَامُوۡا فِيۡهَا فَاذۡهَبۡ اَنۡتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوۡنَ ﴿۲۴﴾﴾ یعنی ''ہم ہرگز داخل نہیں ہوں گے ارضِ فلسطین میں کبھی بھی جب تک کہ جو لوگ آج اس پر قابض ہیں وہ وہاں سے نکل نہ جائیں' تو (اے موسیٰ!) جاؤ تم اور تمہارا رب لڑو' ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔'' اس پر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آ گیا کہ انہوں نے بزدلی دکھائی ہے: ﴿فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيۡهِمۡ اَرۡبَعِيۡنَ سَنَةً ۚ يَتِيۡهُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ ؕ فَلَا تَاۡسَ عَلَى الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِيۡنَ ﴿۲۶﴾﴾ ''پس ارضِ مقدس چالیس برس تک ان پر حرام کر دی گئی ہے۔ اب وہ اس زمین کے اندر بھٹکتے اور بھٹکتے پھریں گے۔ (اے موسیٰ!) اب تم افسوس نہ کرو ان فاسقوں کے بارے میں (کہ ان کا یہ حشر ہو رہا ہے)۔''

ان چالیس برسوں کے دوران حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کا انتقال ہو گیا۔ وہ ساری نسل جو کہ مصر میں غلام رہی تھی' ختم ہو گئی۔ نئی نوجوان نسل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جانشین حضرت یوشع بن نون کی سرکردگی میں رفتہ رفتہ پورا فلسطین فتح کر لیا۔ البتہ

ایک بہت بڑی غلطی یہ ہوئی کہ پورے فلسطین پر کوئی ایک مرکزی حکومت قائم نہیں کی گئی۔ بارہ میں سے دس قبیلوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لیں جبکہ دو قبیلوں کا تاریخ میں سراغ نہیں ملتا کہ کہاں گئے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ وہ بھارت میں آ کر آباد ہوئے۔ یہاں کا برہمن وہی یہودی طبقہ ہے جو اُس وقت برہما یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام لے کر یہاں آیا تھا۔ ﴿صُحُفِ اِبۡرٰهِيۡمَ وَمُوۡسٰى﴾ کا قرآن مجید میں دو جگہ ذِکر ہے لیکن وہ آج ہمارے پاس کہیں نہیں ہیں۔ تورات بگڑی تگڑی ہے تو سہی نا۔ زبور محرف حالت میں سہی، لیکن موجود تو ہے۔ انجیل کیسی بھی ہو، وجود تو رکھتی ہے۔ لیکن آج دنیا میں ''صحف ابراہیم'' کے نام سے کوئی کتاب نہیں ہے۔ ایک رائے ہے کہ ہندوؤں کے اپنشد درحقیقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے ہیں۔ یہ رائے مَیں نے اپنشد کا کچھ مطالعہ کر کے قائم کی ہے۔ بہرحال انہوں نے دس چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لیں، جو باہم دست و گریباں رہنے لگیں۔ آس پاس کی مشرک قومیں ایک دوسرے کے خلاف ان سے مدد لیتیں۔ ہوتے ہوتے ان قوموں کا اتنا اثر و نفوذ ہو گیا کہ تقریباً پورے فلسطین پر وہ قابض ہو گئے اور یہود کو اپنے گھروں سے نکال باہر کیا۔ یہ تین سو برس کی تاریخ ہے جو ان حملوں میں بیان ہوئی ہے۔

پھر انہیں ہوش آیا کہ ہمیں تو جہاد کرنا چاہیے۔ چنانچہ وقت کے نبی سے کہا گیا کہ ہمارے لیے ایک سپہ سالار مقرر کر دیں۔ انہوں نے حضرت طالوت کو معیّن کیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت طالوت کو جالوت کے مقابلے میں فتح دی۔ یہاں سے یہود کی تاریخ کا زریں باب شروع ہوا، جو میرے نزدیک ان کی خلافتِ راشدہ ہے۔ ۱۰۰۰ قبل مسیح سے ۹۰۰ قبل مسیح تک محیط تقریباً ۱۰۰ برس میں پہلے حضرت طالوت تھے، پھر ان کے داماد حضرت داؤد علیہ السلام آئے اور پھر ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام۔ اس کے بعد ان کا ایک دورِ زوال شروع ہو گیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دو بیٹوں کے درمیان یہ سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی: شمالی سلطنت اسرائیل اور جنوبی سلطنت یہودیہ۔ شمالی سلطنت کا دارالخلافت سامریہ جبکہ جنوبی کا یروشلم تھا۔ آپس کی لڑائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۷۰۰ قبل مسیح میں آشوریوں

نے اسرائیل کی شمالی سلطنت ختم کر دی‘ صرف چھوٹی سی جنوبی سلطنت یہودیہ رہ گئی۔ پھر ان کے ہاں فسق و فجور کا بازار گرم ہوا تو اللہ تعالیٰ نے عراق کے بادشاہ اور اُس وقت کے نمرود بخت نصر (Nabuchad Nazzar) کے ہاتھوں ان پر زبردست عذاب مسلط کیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جو معبد (ہیکلِ سلیمانی) بنایا تھا‘ اسے مکمل طور پر مسمار کر دیا گیا۔ لاکھوں افراد یروشلم میں موقع پر قتل ہوئے جبکہ چھ لاکھ یہودی مَردوں‘ عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا کر بابل لے جایا گیا۔

یہودیوں‘ رومن کیتھولکس اور پروٹسٹنٹ عیسائیوں تینوں کی نگاہ اس وقت اس چھوٹے سے علاقے پر ہے۔ یہ سارا معاملہ اب ارضِ فلسطین پر آ گیا ہے۔ اس کا حل کیا ہے؟ ایک اصولی اور مبنی بر انصاف حل تو یہ ہے جو شروع سے تحریک آزادیٔ فلسطین (P.L.O) کا مطالبہ تھا اور اب بھی ”حماس“ کا مطالبہ ہے کہ اسرائیل کا قیام ناجائز طور پر ہوا تھا‘ ہمارے اوپر ظلم کر کے یہاں یہودیوں کو آباد کیا گیا‘ اس لیے اسرائیل کو ختم ہونا چاہیے اور پورے کا پورا فلسطین اس کے اصل رہنے والوں کو دیا جائے۔ لیکن اصل فیصلہ تو طاقت کرتی ہے۔ ؏ ”ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات!“ امریکہ ان کی پشت پر ہے۔ یورپ سے بھی کبھی کبھی امیدیں بنتی ہیں کہ وہ کچھ یہودیوں کے خلاف اور فلسطینیوں کے حق کی بات کر دیتے ہیں لیکن ان کا بھی اصل ایجنڈا یہی ہے کہ یہاں سے یہودیوں اور مسلمانوں سب کو نکال کر رومن کیتھولک حکومت قائم کی جائے۔ بہرحال یہ صورتِ حال ہے۔ ہمارے ہاں بھی کہا جاتا ہے کہ بھئی زمینی حقائق کو دیکھو! ایک زمانہ ہوا کہ ”پی ایل او“ نے ہاتھ ڈال دیے کہ اچھا ٹھیک ہے‘ اسرائیل بھی رہے لیکن ایک فلسطینی ریاست بھی بن جائے۔ اب اس صورتِ حال کو بھی بارہ تیرہ سال گزر گئے ہیں۔ بظاہر اس مسئلے کا کوئی حل ہے ہی نہیں۔ اس چھوٹے سے جغرافیہ پر اتنے لوگوں کی نگاہیں ہیں اور بے چارہ مسلمان وہاں پر پِٹ رہا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو موجودہ حالات میں پی ایل او کی بات بھی کسی درجے میں صحیح ہے۔ امریکہ کے سامنے سر جھکانے کے علاوہ اور کیا چارۂ کار ہے!

بہرحال دنیا کی تازہ ترین صورتِ حال کے مطابق ”آرمیگاڈان“ اب زیادہ دور

نہیں ہے۔ اس کے لیے یورپ بھرپور تیاریاں کر رہا ہے۔ آج کل ایک عجیب بات قبرص کے حوالے سے بھی دیکھنے میں آ رہی ہے۔ کوفی عنان صاحب وہاں بار بار آ رہے ہیں۔ اصل میں نیٹو افواج کا صدر مقام پہلے جرمنی تھا' وہاں سے یہ کوسووو کی طرف منتقل ہوا۔ اب وہاں سے ان کا اگلا قدم قبرص ہے۔ وہیں اصل ''جمپنگ پیڈ'' بنے گا۔ فلسطین یہاں سے بہت قریب ہے' لہٰذا یہیں سے حملہ ہوگا' اور اس حملے میں اتنی خون ریزی ہوگی کہ اس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے' کیونکہ جب تک یہود مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو نہ گرائیں ان کا تھرڈ ٹمپل نہیں بنتا۔ قبضہ ان کے پاس ہے اور دنیا کی عظیم ترین عسکری قوت ان کی پشت پر ہے۔ اب اس سے بڑی بات کیا ہوگی کہ اسرائیلی وزیراعظم شیرون نے فیصلہ کیا ہے کہ غزہ کی پٹّی پر قائم چند یہودی بستیوں کو تو ہم خالی کر دیں گے' جس کا رقبہ محض ۱۴۰ مربع میل ہے' لیکن مغربی کنارے پر ہم اپنی بستیاں نہیں گرائیں گے اور وہ یہودی علاقہ ہی رہے گا۔ امریکہ نے بھی اس منصوبے کی منظوری دے دی ہے۔ اس سے آگے یہ معاملہ ہوا ہے کہ صدر حسنی مبارک نے اپنے حالیہ دورۂ امریکہ کے دوران بش کو یہ دھمکی دی ہے کہ مشرق وسطیٰ میں امن کا عمل طویل ہونے اور روڈ میپ پر اسرائیل کے کاربند نہ ہونے سے عرب دنیا میں بے چینی اور اضطراب بڑھ رہا ہے۔ عوام یہ صورت حال کب تک برداشت کریں گے! عرب نوجوانوں کے اندر یہودیوں کی نفرت رچی ہوئی ہے۔ لہٰذا وہ اٹھیں گے اور پھر ہولناک قتل عام ہوگا۔ اس میں سب سے پہلے امریکہ کے ایجنٹوں کی صورت میں جو مسلمان حکمران بیٹھے ہوئے ہیں وہ اپنے نوجوانوں کو ختم کریں گے۔ ملّتِ عرب کے لیے انتہائی خون ریز معاملہ آنے والا ہے۔ یہ ہے وہ ہولناک منظر جسے حضور ﷺ نے الملحمۃ العظمیٰ اور الملحمۃ الکبریٰ یعنی تاریخِ انسانی کی عظیم ترین جنگ سے تعبیر کیا ہے۔ مستقبل سوائے اس کے اور کوئی نہیں۔ کوئی راستہ نہیں۔

(۲۰۰۴ء کا ایک اخباری کالم)

❁❁❁

لقمان حکیم کی وصیتیں (۲)

مقصود الحسن فیضی

لقمان حکیم کی وصیتیں

اب ہم ان نصیحتوں کا بالترتیب ذکر کر رہے ہیں جو لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو کی تھیں۔ ان کا ذکر سورۃ لقمان کی آیات ۱۳ تا ۱۹ میں ہے۔ سب سے پہلے ہم ان آیات اور ان کے ترجمے کا مطالعہ کر لیتے ہیں:

﴿وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّ الشِّرْكَ
لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ⑬ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰي وَهْنٍ
وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ۭ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ⑭ وَاِنْ جَاهَدٰكَ
عَلٰٓي اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا
مَعْرُوْفًا ۡ وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا
كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ⑮ يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ
صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ⑯
يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰي مَآ
اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ⑰ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا
تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ⑱ وَاقْصِدْ فِيْ
مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۭ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ⑲﴾

”یاد کرو جب لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا تو اس نے کہا: ”بیٹا! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا‘ حق یہ ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی خود تاکید کی ہے‘ اس کی ماں نے ضعف پر ضعف

اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے' (اسی لیے ہم نے اسے نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجا لا' میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔ لیکن اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی اور کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو توان کی بات ہرگز نہ مان' دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ' مگر پیروی اس شخص کے راستے کی کرنا جس نے میری طرف رجوع کیا ہے' پھر سب کو پلٹنا میری ہی طرف ہے' اس وقت میں تمہیں بتادوں گا کہ تم کیسے عمل کرتے رہے ہو۔ (اور لقمان نے کہا:) بیٹا! کوئی چیز رائی کے دانہ برابر بھی ہو اور کسی چٹان میں یا آسمانوں یا زمین میں کہیں چھپی ہوئی ہو' اللہ اسے نکال لائے گا' وہ باریک بین اور باخبر ہے۔ بیٹا! نماز قائم کر' نیکی کا حکم دے' بدی سے منع کر' اور جو مصیبت بھی پڑے اس پر صبر کر' یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔ اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر' نہ زمین میں اکڑ کر چل' اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔ اپنی چال میں اعتدال اختیار کر اور اپنی آواز ذرا پست رکھ' سب آوازوں سے زیادہ بری آواز گدھے کی آواز ہوتی ہے۔''

پہلی وصیت: شرک کی قباحت

حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو سب سے پہلی وصیت شرک کی قباحت سے متعلق تھی، جس میں توحید کی تاکید بھی یقیناً شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاِذۡ قَالَ لُقۡمٰنُ لِابۡنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشۡرِكۡ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ ۝۱۳﴾

''اور جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: اے میرے بیٹے! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا' بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم و دانا باپ وہ ہے جو اپنی اولاد کو سب سے پہلے اللہ کی معرفت کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ سب سے اہم وصیت ہے اور اسی کو بچوں کی تربیت کی اساس ہونا چاہیے۔ یہی اللہ تعالیٰ کا انسان پر سب سے پہلا اور سب سے عظیم حق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے شکر کا سب سے اہم میدان اس کی توحید کو بجالانا ہے' جیسا کہ آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَنِ اشۡكُرۡ لِيۡ وَلِوَالِدَيۡكَ ؕ اِلَيَّ الۡمَصِيۡرُ ۝۱۴﴾ ''(ہم نے انسان کو یہ وصیت کی کہ) میرا اور اپنے والدین کا شکریہ ادا کرو' میری طرف ہی (تمہیں) لوٹنا ہے''۔ یہیں سے یہ بھی واضح ہو جاتا

ہے کہ اللہ ربّ العالمین کی نعمتوں کی ناشکری اور ناقدری کی سب سے قبیح صورت اس کے ساتھ شرک کرنا ہے۔

حضرت لقمان نے شرک کو ظلم عظیم قرار دیا‘ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی ظلم ہے اور خود اپنے اوپر بھی ظلم ہے۔ظلم کی تعریف ہے:’’وضع الشيء في غير محله ‘‘یعنی کسی چیز کو اس کی اصل جگہ پر نہ رکھا جائے۔ چونکہ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے لہٰذا اگر یہ حق کسی اور کو دے دیا گیا تو گویا اسے اس کی اصل جگہ سے کسی اور جگہ رکھ دیا گیا۔

شرک کر کے بندہ اپنے اوپر بھی ظلم کرتا ہے جس کی متعدد وجوہات ہیں:

(۱) شرک ایسا گناہ ہے جس کی بخشش نہیں۔ مشرک بندہ اگر بغیر توبہ کیے اس دنیا سے چلا جائے تو اللہ تعالیٰ اسے کبھی معاف نہیں فرمائے گا۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾ ﴾(النساء) ’’بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنایا جائے‘ اور اس کے علاوہ گناہوں کو جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔‘‘

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

((الظُّلْمُ ثَلَاثَةٌ: فَظُلْمٌ لَا يَغْفِرُهُ اللّٰهُ ، وَظُلْمٌ يَغْفِرُهُ اللّٰهُ ،وَظُلْمٌ لَا يَتْرُكُهُ اللّٰهُ ، فَأَمَّا الظُّلْمُ الَّذِي لَا يَغْفِرُهُ اللّٰهُ فَالشِّرْكُ ، وَقَالَ اللّٰهُ: "اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ" وَأَمَّا الظُّلْمُ الَّذِي يَغْفِرُهُ اللّٰهُ فَظُلْمُ الْعِبَادِ لِأَنْفُسِهِمْ فِيمَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ رَبِّهِمْ، وَأَمَّا الظُّلْمُ الَّذِي لَا يَتْرُكُهُ اللّٰهُ فَظُلْمُ الْعِبَادِ بَعْضِهِمْ بَعْضًا حَتّٰى يَدِينَ لِبَعْضِهِمْ مِنْ بَعْضٍ))(۱۵)

’’ظلم تین طرح کا ہے: ایک ظلم وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ کبھی معاف نہیں کرے گا‘ اور دوسرا ظلم وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ معاف کر دے گا‘ اور تیسرا ظلم وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نہیں چھوڑے گا۔جس ظلم کو اللہ تعالیٰ کبھی معاف نہیں کرے گا وہ شرک ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ’’بلاشبہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔‘‘ اور جس ظلم کو اللہ معاف کر دے گا وہ بندوں کا اپنی جانوں پر ظلم (گناہ) کرنا ہے‘ جو اُن کا اور اُن کے رب کے درمیان کا معاملہ ہوگا۔اور جس ظلم کو اللہ نہیں چھوڑے گا وہ بندوں کا ایک دوسرے پر ظلم کرنا ہے‘ (اور اسے اللہ تعالیٰ

اس وقت تک نہیں چھوڑے گا) یہاں تک کہ انہیں ایک دوسرے سے بدلہ لے کرنہ دے دے۔''

(۲) اس برائی کی موجودگی میں ہدایت وامن کا حصول ممکن نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَمۡ یَلۡبِسُوۡۤا اِیۡمَانَہُمۡ بِظُلۡمٍ اُولٰٓئِکَ لَہُمُ الۡاَمۡنُ وَہُمۡ مُّہۡتَدُوۡنَ ﴿۸۲﴾﴾ (الانعام)

''جولوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو شرک کے ساتھ آلودہ نہیں کیا' انہی کے لیے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔''

(۳) شرک سے تمام اعمال برباد ہو جاتے ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَلَوۡ اَشۡرَکُوۡا لَحَبِطَ عَنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸۸﴾﴾ (الانعام)

''اور اگر یہ حضرات (مذکورہ انبیاء) بھی شرک کرتے تو ان کے تمام اعمال ضائع ہو جاتے۔''

نیز فرمایا:

﴿وَلَقَدۡ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ وَاِلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکَ ۚ لَئِنۡ اَشۡرَکۡتَ لَیَحۡبَطَنَّ عَمَلُکَ وَلَتَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۶۵﴾﴾ (الزمر)

''(اے نبی ﷺ!) یقیناً آپ کی طرف بھی اور آپ سے پہلے (کے تمام نبیوں) کی طرف بھی یہ وحی کی گئی ہے کہ اگر آپ نے کسی کو اللہ کا شریک بنایا تو بلاشبہ آپ کا عمل ضائع ہو جائے گا اور یقیناً آپ خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔''

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

((أَنَا أَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ، مَنْ عَمِلَ عَمَلًا أَشْرَكَ فِيهِ مَعِي غَيْرِي، تَرَكْتُهُ وَشِرْكَهُ)) [۱۶] ''میں شریکوں میں سے شرک سے سب سے زیادہ بے نیاز ہوں' (لہٰذا) جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس میں میرے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کر دیا' میں اُسے اور اُس کے شرک کو چھوڑ دوں گا (یعنی اس کا وہ عمل باطل ہوگا اور اس پر اسے کوئی اجر نہیں ملے گا)۔''

(۴) مشرک پر جنّت حرام اور جہنم واجب ہو جاتی ہے اور حشر میں اس کا کوئی معین و مددگار نہیں ہوگا۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿اِنَّہٗ مَنۡ یُّشۡرِکۡ بِاللّٰہِ فَقَدۡ حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِ الۡجَنَّۃَ وَمَاۡوٰىہُ النَّارُ ؕ وَمَا

لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿۷۲﴾ (المائدۃ)

’’بے شک جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائے گا تو اللہ نے اس پر جنّت حرام کر دی ہے‘ اور اس کا ٹھکانا جہنم ہی ہے‘ اور (ایسے) ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔‘‘

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ((مَنْ مَاتَ يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ النَّارَ))’’جسے اس حال میں موت آئی کہ وہ اللہ کے ساتھ کچھ بھی شریک کرتا تھا‘ وہ آگ میں داخل ہوگا۔‘‘(۱۷)

شرک کی انہی قباحتوں کی وجہ سے ہر نبی اور رسول نے اپنی اُمّت کو اس کبیرہ گناہ سے روکا۔ بلکہ شرک کی مذمت تمام انبیاء ورُسل علیہم السلام کی دعوت کا بنیادی اور مرکزی نکتہ رہا۔ اللہ وحدہ لاشریک کا فرمان ہے:

﴿وَلَقَدۡ بَعَثۡنَا فِىۡ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوۡلًا اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَاجۡتَنِبُوا الطَّاغُوۡتَ‌ ۚ﴾ (النحل: ۳۶)

’’اور ہم نے ہر اُمّت میں ایک رسول (اس پیغام کے ساتھ) بھیجا کہ (لوگو!) صرف اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت (اس کے سوا معبودوں) کی عبادت سے بچو۔‘‘

دوسری وصیت: والدین کے ساتھ حسنِ سلوک

﴿وَوَصَّيۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَيۡهِ‌ ۚ﴾ ’’اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی خاص تاکید کی ہے۔‘‘

چونکہ نوجوان عموماً حقوق و واجبات کی اہمیت کو محسوس نہیں کرتے اس لیے توحید کے بعد دوسری وصیت والدین کے ساتھ حسن سلوک کے بارے میں ہے۔ والدین کے حقوق کی ادائیگی سے نوجوان کے دل میں بقیہ حقوق کی ادائیگی اور ان کے احترام کا جذبہ بھی پیدا ہوگا‘ جیسے کہ دیگر رشتہ داروں اور پڑوسیوں وغیرہ کے حقوق۔

اس بارے میں مفسّرین کا اختلاف ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک حضرت لقمان کی وصیتوں کے ضمن میں ہے یا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے! سلسلہ کلام کے لحاظ سے پہلے قول کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت لقمان نے جہاں اپنے بیٹے کو اللہ تعالیٰ کے حق کی وصیت کی وہیں والدین کے حق کی بھی وصیت کی‘ جس میں والدہ کے حق کو والد کے حق پر مقدّم رکھا۔ قرآن

وحدیث میں بھی یہ امر اسی طرح بیان ہوا ہے کہ متعدد جگہ جہاں اللہ کی عبادت کی تاکید ہے وہیں والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی بھی تاکید وارد ہے۔ البتہ اسلوب کے لحاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ قرآن حکیم میں دیگر مقامات پر بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے حق (توحید) کے بیان کے بعد والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَوَصَّيۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَيۡهِ حُسۡنًا ؕ وَاِنۡ جَاهَدٰكَ لِتُشۡرِكَ بِىۡ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡهُمَا ؕ اِلَىَّ مَرۡجِعُكُمۡ فَاُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ۝﴾

(العنکبوت)

''اور ہم نے انسان کو وصیت کی کہ اپنے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔ اور اگر وہ تمہیں میرے ساتھ اسے شریک بنانے پر مجبور کریں جس کے بارے میں تمہیں کچھ علم نہیں تو ان کی اطاعت مت کرنا۔ میری طرف ہی تم سب کو لوٹنا ہے' پھر مَیں تمہیں تمہارے اعمال کی خبر دوں گا۔''

ایک اور مقام پر فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَوَصَّيۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَيۡهِ اِحۡسٰنًا ؕ حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ كُرۡهًا وَّوَضَعَتۡهُ كُرۡهًا ؕ وَحَمۡلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوۡنَ شَهۡرًا ؕ﴾ (الاحقاف:۱۵)

''اور ہم نے انسان کو وصیت کی کہ اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ اُس کی ماں نے تکلیف کے ساتھ اسے اٹھایا اور مشقت کے ساتھ اسے جنم دیا۔ اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے کی مدّت تیس مہینے تھی۔''

بہرحال جو بھی صورت ہو' خواہ یہ حضرت لقمان حکیم کی وصیت کا حصہ ہو جیسا کہ سیاق و سباق کا تقاضا ہے' یا فائدہ کے لیے اللہ ربّ العالمین کی طرف سے اضافہ ہو جیسا کہ اسلوب کلام کا تقاضا ہے' ہر صورت میں اصل مقصد والدین کے حق کی وضاحت ہے جس کا حاجت مند ایک جوان ہر ماحول میں ہوتا ہے۔

اس مقام پر والدین کے حقوق کے ضمن میں تین اہم باتیں بیان ہوئی ہیں:

(۱) والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم۔ یہ حکم قرآن مجید کے اور بھی کئی مقامات پر بیان

ہوا ہے۔سورۃ العنکبوت اور سورۃ الاحقاف کی آیات اوپر گزر چکی ہیں۔مزید مقامات ملاحظہ ہوں:

﴿وَاعۡبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشۡرِکُوۡا بِہٖ شَیۡئًا وَّ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا﴾ (النساء:۳۶)

”اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔“

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿قُلۡ تَعَالَوۡا اَتۡلُ مَا حَرَّمَ رَبُّکُمۡ عَلَیۡکُمۡ اَلَّا تُشۡرِکُوۡا بِہٖ شَیۡئًا وَّبِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا ۚ﴾ (الانعام:۱۵۱)

”آپ کہہ دیجیے کہ آؤ میں تمہیں وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمہارے رب نے تم پر لازم فرما دیا ہے (دوسرے ترجمہ کے مطابق تم پر حرام کر دیا ہے)۔وہ یہ کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔“

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ وَ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا ؕ﴾ (الإسراء:۲۳)

”اور آپ کے رب نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔“

یہ ایسا حکم ہے جو پہلے رسولوں کی شریعت میں بھی رہا ہے۔بنی اسرائیل سے اس ضمن میں پختہ عہد لیا گیا تھا:

﴿وَ اِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰہَ ۟ وَ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا﴾ (البقرۃ:۸۳)

”اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ وعدہ لیا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔“

احادیث میں بھی والدین کے ساتھ حسن سلوک کی ترغیب اور فضیلت بکثرت وارد ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سوال کیا: أَيُّ العَمَلِ أَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ ؟ کون سا عمل اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ((الصَّلَاةُ عَلٰى وَقْتِهَا)) ”نماز کو اُس کے وقت پر ادا کرنا۔“ مَیں نے پوچھا: پھر کون سا عمل؟ آپؐ نے

فرمایا: ((بِرُّ الْوَالِدَيْنِ)) ’’والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا‘‘ میں نے پوچھا: اس کے بعد کون سا عمل اللہ کو محبوب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((الجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ)) ’’اللہ کے راستے میں جہاد کرنا‘‘ اور اگر میں آپؐ سے کچھ اور اعمال کی بابت سوال کرتا تو آپؐ مجھے مزید اعمال کے بارے میں بھی بتاتے۔[۱۸]

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حق (نماز) کے بعد والدین کے حق کو ذکر کر کے اس کی فضیلت کو واضح فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ جس حدیث میں ایک غار میں پھنسے ہوئے تین لوگوں کا قِصّہ مذکور ہے‘ اس سے بھی والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

(۲) والدہ کا حق والد سے پہلے بیان ہوا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدمت اور حسنِ سلوک میں والدہ کا مقام والد کے حق پر مقدّم ہے۔ حضرت ابوہریرہ ؓ سے مروی ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور سوال کیا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، مَنْ أَحَقُّ النَّاسِ بِحُسْنِ صَحَابَتِي؟ اے اللہ کے رسول ﷺ! لوگوں میں سے میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ((أُمُّكَ)) ’’تیری ماں‘‘ اس نے پوچھا: پھر کون؟ آپؐ نے فرمایا: ((ثُمَّ أُمُّكَ)) ’’پھر تیری ماں‘‘۔ اُس نے سوال کیا: پھر کون؟ آپؐ نے فرمایا: ((ثُمَّ أُمُّكَ)) ’’پھر تیری ماں‘‘۔ اُس نے پوچھا: پھر کون؟ آپؐ نے فرمایا: ((ثُمَّ أَبُوكَ)) ’’پھر تیرا باپ۔‘‘[۱۹]

حضرت معاویہ بن حیدہ ؓ کہتے ہیں مَیں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا: مَنْ أَبَرُّ؟ مَیں (سب سے زیادہ) اچھا برتاؤ کس کے ساتھ کروں؟ آپؐ نے فرمایا: ((أُمَّكَ)) ’’اپنی ماں کے ساتھ‘‘۔ مَیں نے دوبارہ پوچھا: مَیں (اس کے بعد سب سے زیادہ) اچھا برتاؤ کس کے ساتھ کروں؟ آپؐ نے فرمایا: ((أُمَّكَ)) ’’اپنی ماں کے ساتھ‘‘۔ مَیں نے پھر پوچھا: مَیں (اس کے بعد سب سے زیادہ) اچھا برتاؤ کس کے ساتھ کروں؟ آپؐ نے فرمایا: ((أُمَّكَ)) ’’اپنی ماں کے ساتھ‘‘۔ مَیں نے کہا: مَیں (اس کے بعد سب سے زیادہ) اچھا برتاؤ کس کے ساتھ کروں؟ آپؐ نے فرمایا: ((ثُمَّ أَبَاكَ، ثُمَّ الْأَقْرَبَ فَالْأَقْرَبَ)) ’’پھر اپنے باپ کے ساتھ‘ اور پھر قریبی سے قریبی رشتہ دار کے ساتھ (حسنِ سلوک کرو)۔‘‘[۲۰]

یہ مسئلہ کہ والدہ کا حق والد سے زیادہ ہے‘ عموماً علماء نے اس پر اہلِ علم کا اجماع نقل کیا ہے‘ اور کچھ دیگر علماء نے اسے جمہور کا قول قرار دیا ہے۔[۲۱] شارحینِ حدیث اور علمائے حدیث

نے اس کے تین اسباب بیان کیے ہیں: (i) حمل (ii) وضع حمل کی تکلیف (iii) رضاعت۔ یعنی یہ تین عمل ایسے ہیں جو والدہ ہی کو برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ اس کی دلیل سورۃ لقمان کی آیت ۱۴ اور سورۃ الاحقاف کی آیت ۱۵ ہے‘ جو ماقبل گزر چکی ہیں۔ چونکہ مذکورہ تینوں کام والدہ کے ساتھ مخصوص ہیں (اس لیے اس کا مقام بھی زیادہ ہے)‘ جبکہ اس کے علاوہ باقی امور میں ماں باپ دونوں شریک ہیں۔

(۳) والدین کے حقوق کی اگرچہ بڑی اہمیت ہے اور بندے پر ان کا سب سے بڑا حق ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کے حق کو اللہ کے حق پر مقدم رکھا جائے‘ بلکہ اللہ تعالیٰ کا حق ہر حال میں مقدم رہے گا۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۡ وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ﴾ (لقمٰن:۱۵)

’’اور اگر وہ دونوں تجھے اس بات پر مجبور کریں کہ تو کسی ایسے کو میرا شریک بنا جس کا تجھے علم نہیں‘ تو ان کی بات نہ مان‘ اور دنیا میں ان کے ساتھ بھلائی کرتا رہ۔ مگر پیروی اُس شخص کے راستے کی کرنا جس نے میری طرف رجوع کیا ہے۔‘‘

یعنی خواہ وہ کتنی کوشش کریں کہ تم شرک میں مبتلا ہو جاؤ‘ ان کی بات ہرگز قبول نہ کرنا‘ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے کاموں میں کسی بھی مخلوق کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔ حضرت علی بن ابی طالب ؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ((لَا طَاعَةَ فِي مَعْصِيَةِ اللّٰهِ، إِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوفِ)) ’’اللہ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت نہیں‘ (مخلوق کی) اطاعت تو صرف نیکی کے کاموں میں ہے۔‘‘[۲۲]

مذکورہ آیت یا سورۃ العنکبوت کی آیت ۸ کے شانِ نزول میں مفسّرین نے حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ اور ان کی والدہ کا واقعہ ذکر کیا ہے۔ حضرت سعد ؓ جب مسلمان ہو گئے تو ان کی والدہ نے قسم کھالی کہ وہ ان کے ساتھ اس وقت تک بات نہیں کریں گی اور نہ ہی کچھ کھائیں پئیں گی جب تک وہ اپنا دین ترک نہ کر دیں۔ اس موقع پر حضرت سعد ؓ کی ماں نے ان سے یہ بھی کہا کہ تم دعویٰ کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے‘ اور مَیں تمہاری ماں تمہیں یہ حکم دے رہی ہوں کہ تم ایسا کرو۔ حضرت سعد ؓ نے ان کی بات نہ مانی

تو وہ تین دن تک بھوکی پیاسی رہیں حتیٰ کہ مشقت کی تاب نہ لاتے ہوئے بے ہوش ہوگئیں۔ اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں۔(۲۳)

اگر والدین کافر اور مشرک ہوں اور شرک اور کفر قبول کرنے لیے دباؤ ڈالیں تو ان کی اطاعت تو جائز نہیں ہے البتہ اس حالت میں بھی ان کے ساتھ حسن سلوک مشروع ہے' جس کے لیے درج ذیل اسلوب اختیار کیے جائیں گے:

(i) دستور کے مطابق ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے گا' یعنی ان کا احترام کیا جائے۔ انہیں پکارنے اور مخاطب کرنے میں احترام کو مدِنظر رکھا جائے۔ جیسے ابو جان' امی جان وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کیے جائیں۔ اس کی بہترین مثال ہمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آپؑ کے مشرک باپ کے ساتھ مکالمہ میں نظر آتی ہے۔ آپ بار بار اپنے باپ کو یَا اَبَتِ (ابا جان!) کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ (سورۂ مریم' رکوع ۳)

(ii) حتی الامکان ان کی جائز ضروریات پوری کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس بارے میں حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما کا واقعہ بہت مشہور ہے کہ جب انہوں نے اپنی مشرک ماں کے ساتھ صلہ رحمی کی بابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ((نَعَمْ، صِلِي أُمَّكِ)) ''ہاں! اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کرو (یعنی ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور ان کی حاجت کو پورا کرو)۔''(۲۴)

(iii) ان کی طرف سے آنے والی تکلیف اور سختی پر صبر کیا جائے۔ ان کے ساتھ ڈانٹ ڈپٹ والا اسلوب ہرگز اختیار نہ کیا جائے۔

(iv) ان کی ہدایت کے لیے دعا کرتے رہنا چاہیے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝۲۴﴾ (الاسراء)

''اور عاجزی اور محبت کے ساتھ ان کے سامنے تواضع کا بازو پست کیے رکھنا' اور دعا کرتے ہوئے کہتے رہنا کہ: اے میرے پروردگار ان پر اُسی طرح رحم فرما جیسا کہ انہوں نے میرے بچپن میں میری پرورش کی ہے۔''

تیسری وصیت: اللہ کا مراقبہ

(اس کی نگرانی اور قیامت کے دن جواب دہی کا احساس)

﴿ یٰبُنَیَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ۝۱۶ ﴾

''(اور لقمان نے کہا:) بیٹا! کوئی چیز رائی کے دانہ کے برابر بھی ہو اور کسی چٹان میں یا آسمانوں یا زمین میں کہیں چھپی ہوئی ہو' اللہ اسے نکال لائے گا۔ یقیناً وہ باریک بین اور باخبر ہے۔''

نوجوانوں کی طبیعت میں عموماً غصہ اور طیش ہوتا ہے۔ وہ کوئی کام کرتے ہوئے انجام کی پرواہ نہیں کرتے۔ اس کی بنا پر ایک نوجوان بعض اوقات ایسے اقدامات کر بیٹھتا ہے جن سے اس کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ لہٰذا اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ نوجوانوں کے دل میں اللہ تعالیٰ کی نگرانی اور اس کی خشیت کا ایسا قوی احساس پیدا کیا جائے جسے وہ جلوت وخلوت میں ملحوظِ خاطر رکھیں۔ ان کے دل میں اللہ کے سامنے جواب دہی کا خوف ہو اور اپنی ذمہ داری کا احساس بھی۔ چونکہ اس مقام پر کی گئی دیگر وصیتوں پر مراقبہ کے بغیر عمل ممکن نہیں تھا' اسی لیے حضرت لقمان نے بیٹے کو اس کی نصیحت کی۔

یہاں ''کوئی چیز'' سے مراد برائی یا اللہ کی نافرمانی کا کوئی کام ہے جو بندوں سے سرزد ہوتے ہیں۔ اللہ کے مراقبے اور اس کی نگرانی کی اہمیت واضح کرنے لیے حضرت لقمان نے یہاں دو باتوں کا ذکر کیا ہے:

(۱) اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت: اللہ تعالیٰ کا علم اس قدر وسیع ہے کہ وہ کائنات میں موجود ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی جانتا ہے۔ کوئی باریک سے باریک چیز بھی اس سے مخفی نہیں ہے۔ ہر پوشیدہ چیز اس پر عیاں ہے۔ وہ صرف انسان کے ظاہری افعال اور اقوال سے ہی باخبر نہیں بلکہ اسے انسان کے دل میں پیدا ہونے والے ایک ایک خیال تک کا پورا علم ہے۔ ربِّ کائنات کا ارشادِ گرامی ہے: ﴿ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ۝۱۹ ﴾ (غافر) ''وہ آنکھوں کی خیانت اور جو کچھ سینے (اپنے اندر) چھپاتے ہیں اسے جانتا ہے۔''

(۲) ایمان بالآخرت پر توجہ: ایک ایسے دن کی آمد برحق ہے جس میں تمہیں ربّ ذوالجلال کے

حضور حاضر ہونا ہے۔ پھر وہ تمہاری ہر نیکی و بدی کا حساب لے گا اور عدل و انصاف سے بدلہ دے گا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ۭ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۭ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ۴۷﴾ (الانبیاء)

”اور قیامت کے دن ہم (لوگوں کے اعمال تولنے کے لیے) عدل و انصاف والے ترازو قائم کریں گے‘ پھر کسی پر کچھ بھی ظلم نہ کیا جائے گا۔ اور اگر ایک رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی عمل ہو گا ہم اسے حاضر کریں گے‘ اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے۔“

نیز فرمایا:

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۷ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۸﴾ (الزلزال)

”پس جس نے ذرّہ برابر کوئی نیکی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا۔ اور جس نے ذرّہ برابر کوئی برائی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا۔“

سورۂ لقمان کی مذکورہ آیت میں یہ تعلیم دی جا رہی ہے کہ نوجوان کی تربیت اللہ تعالیٰ کے مراقبہ اور نگرانی کے احساس پر کی جانی چاہیے۔ اس کے دل میں احساس جگانا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا علم بہت وسیع ہے اور اس کی صفت ہر چیز کو محیط ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم جو بھی کرو گے وہ سب اللہ کے علم میں ہے اور وہ تمہاری ایک ایک حرکت کو دیکھ رہا ہے۔ جب بچوں کی تربیت اس نہج پر کی جائے گی تو وہ بہت سارے گناہوں سے دور رہنے میں کامیاب ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی اس شان کا بیان قرآن مجید میں متعدد جگہ ہوا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۳﴾ (سبا)

”اللہ عالم الغیب (غیب کی باتیں جاننا) ہے‘ آسمانوں اور زمین میں ایک ذرہ برابر بھی کوئی چیز اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے‘ اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ اس سے بڑی‘ ہر چیز اور ہر بات ایک روشن کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔“

نیز فرمایا:

﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿٥٩﴾﴾ (الانعام)

’’اور اُسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا‘ اور جو کچھ خشکی اور تری میں ہے اسے وہ جانتا ہے‘ اور جو پتا بھی گرتا ہے اس کا بھی اسے علم ہے‘ اور زمین کی تاریکیوں میں کوئی بھی دانہ ہو اور کوئی بھی خشک یا تر چیز ہو مگر وہ ایک واضح کتاب (لوحِ محفوظ) میں ہے۔‘‘

قول و عمل ہی نہیں بلکہ انسانوں کے نقشِ قدم بھی لکھے جا رہے ہیں:

﴿اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ؕ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿١٢﴾﴾ (یٰسٓ)

’’بے شک ہم مُردوں کو زندہ کریں گے‘ اور ہم وہ اعمال لکھ رہے ہیں جنہیں لوگ آگے بھیج رہے ہیں اور ان کے قدموں کے نشانات بھی (لکھ رہے ہیں)۔ اور ہم نے ہر چیز کو ایک واضح کتاب (لوحِ محفوظ) میں درج کر رکھا ہے۔‘‘

جب والدین اس اصول پر اپنی اولاد کی تربیت کریں گے تو قوی امید ہے کہ ان میں جلوت و خلوت ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہنے کی کیفیت پیدا ہو گی۔ لہٰذا والدین کو اس طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے‘ کیونکہ خشیتِ الٰہی ہی نفسانی خواہشات کے آگے ایک مضبوط رکاوٹ ثابت ہوتی ہے اور کامیابی کا زینہ بنتی ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((ثَلَاثٌ مُنْجِيَاتٌ: خَشْيَةُ اللهِ عَزَّوَجَلَّ فِي السِّرِّ وَالْعَلَانِيَةِ ، وَالْقَصْدُ فِي الْغِنَى وَالْفَقْرِ ، وَالْعَدْلُ فِي الرِّضَا وَالْغَضَبِ)) [۲۵]

’’تین کام نجات کا ذریعہ ہیں: جلوت و خلوت میں اللہ سے ڈرنا‘ امیری و فقیری (دونوں حالتوں) میں میانہ روی اختیار کرنا اور رضا و غضب میں عدل و انصاف کرنا۔‘‘

حواشی

(۱۵) علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ دیکھئے: صحیح الجامع الصغیر: ۶۱۳۹، الصحیحۃ: ۱۹۲۷

(۱۶) صحیح مسلم:۵۳۔ كِتَابُ الزُّهْدِ وَالرَّقَائِقِ :۵،بَابُ مَنْ أَشْرَكَ فِي عَمَلِهِ غَيْرَ اللّٰهِ' ح:2985

(۱۷) صحیح البخاري:۱۲۳۸' صحیح مسلم:۹۲

(۱۸) صحیح البخاري:۵۹۷۰' صحیح مسلم:۸۵

(۱۹) صحیح البخاري:۵۹۷۱' صحیح مسلم:۲۵۴۸

(۲۰) مسند أحمد ۳۳/ ۲۳۰' ح:۲۰۰۲۸' الأدب المفرد:۳' سنن أبي داود:۵۱۳۹

(۲۱) موعظة لقمان لولده: ص ۳۵

(۲۲) صحیح البخاري:۷۲۵۷' صحیح مسلم:۱۸۴۰

(۲۳) صحیح مسلم:۱۷۴۸' سنن الترمذی:۳۱۸۹

(۲۴) صحیح البخاري:۵۹۷۸' صحیح مسلم:۱۰۰۳

(۲۵) اعتلال القلوب للخرائطي:۱۰۲' شعب الایمان:۶۸۶۵' المعجم الأوسط للطبراني: ۵۴۵۲۔ الفاظ خرائطی کے ہیں۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے' دیکھئے الصحیحہ:۱۸۰۲

❁❁❁

بقیہ: بیان القرآن

اُس دن سرِ محشر پکارا جائے گا: ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ﴾ (المؤمن:۱۶) کہ اے نسلِ انسانی کے لوگو' دیکھو! آج حکومت' اختیار اور اقتدار کس کے ہاتھ میں ہے؟ اور اس سوال کا جواب بھی پھر خود ہی دیا جائے گا: ﴿لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ (المؤمن:۱۶) یعنی آج کے دن اختیارِ کُل کا کُل اللہ ہی کے پاس ہے جو اکیلا ہے اور سب پر غالب ہے۔ اس دن انسانوں کی اکثریت کو بے بسی اور نفسا نفسی کی جس کیفیت کا سامنا ہوگا' سورۃ البقرۃ میں اس کا نقشہ یوں دکھایا گیا ہے: ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾﴾ ''اور ڈرو اُس دن سے کہ جس دن کام نہ آسکے گی کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ بھی اور نہ کسی سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ کسی سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ انہیں کوئی مدد ہی مل سکے گی۔''

❁❁❁

ادب اور احترام

شعبہ تعلیم وتربیت، تنظیم اسلامی

''ادب'' عربی زبان کا لفظ ہے جس کا اردو میں مفہوم ہم اس طرح بیان کر سکتے ہیں:
''کسی چیز کی حد نگاہ میں رکھنا، حفظِ مراتب کا لحاظ رکھنا، تہذیب، شائستگی اور تمیز۔''

پہلے زمانے میں استاد کو مؤدِب بھی کہا جاتا تھا، یعنی ''ادب سکھانے والا''۔ اُس وقت اساتذہ بچوں کو متعلقہ علوم پڑھانے کے ساتھ ''آداب'' بھی سکھایا کرتے تھے۔ یہ ایک مسلم معاشرے کی روایت تھی۔ لہٰذا علم کے ساتھ ادب بھی آنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کا ادب

سب سے پہلے ہمیں ''اللہ تعالیٰ کا ادب'' کرنا آنا چاہیے۔ اللہ ربّ العزت کے ادب کا سب سے پہلا تقاضا یہ ہے کہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ سورۂ لقمان کی آیت ۱۳ میں فرمانِ الٰہی ہے: ﴿لَا تُشۡرِكۡ بِاللّٰهِ﴾ ''اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔'' یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا جو مقام ہے، اُسے اسی مقام پر رکھا جائے۔ نہ تو مخلوق میں سے کسی کا مرتبہ بڑھا کر اللہ کے برابر کیا جائے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کو اُس کے اعلیٰ مقام سے اُتار کر مخلوق کے برابر لا کر کھڑا کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کے ادب کا اوّلین تقاضا ہے: ''اللہ اکبر'' (اللہ سب سے بڑا ہے)۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی کبریائی کو تسلیم کیا جائے اور اس کا اظہار واعلان کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کے ادب سے یہ بھی مراد ہے کہ اس کے سامنے عاجزی اور خشوع وخضوع اختیار کیا جائے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۝۱ الَّذِيۡنَ هُمۡ فِيۡ صَلَاتِهِمۡ خٰشِعُوۡنَ ۝۲﴾ (المؤمنون)

''کامیاب ہو گئے اہل ایمان، وہ جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں۔''

یعنی وہ مؤمن کامیاب ہونے والے ہیں جن کی نماز کے اندر خشوع وخضوع ہوگا۔ یہ مؤمن اپنے ربّ کے سامنے جھکے رہتے ہیں۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ادب کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ اس کی تسبیح بیان کی جائے۔ اُس کا کثرت سے ذکر کیا جائے۔ اُس کی عظمت کا تصور کیا جائے۔ ہمیں چاہیے کہ اُسی کو اپنی زندگی کا محور بنالیں۔ اُسی کے نام سے جئیں اور اُسی کے نام سے مریں‘ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿قُلۡ اِنَّ صَلَاتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۶۲﴾﴾ (الانعام)

’’کہیے: میری نماز‘ میری قربانی‘ میری زندگی اور میری موت اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿کُوۡنُوۡا رَبّٰنِیّٖنَ﴾ (آلِ عمران:۷۹) ’’اللہ والے بن جاؤ‘‘۔ یعنی ایسے اللہ والے بن جاؤ کہ بس اللہ تمہارے دل پر چھا جائے۔ اٹھتے بیٹھتے وہی یاد آئے۔ اُس سے شدید ترین محبت ہو جائے۔

ہمیں اللہ تعالیٰ کے نام کا بھی ادب کرنا چاہیے۔ کسی کاغذ پر اللہ کا نام لکھا ہوا ہو تو اسے ردّی کی ٹوکری میں نہ پھینکیں۔ زمین پر کوئی کاغذ پڑا ہوا نظر آئے جس پر اللہ کا نام لکھا ہوا ہو تو اسے اٹھا کر کہیں اونچی جگہ پر رکھ دیں۔ اللہ کے نام پر جھوٹی قسمیں نہ کھائیں۔ لغو اور لہو ولعب کے کاموں پر اللہ کا نام مت لیں‘ یعنی ایسے کام بسم اللہ پڑھ کر شروع نہ کریں۔ اللہ کی قسم کھا کر کبھی یہ نہیں کہنا چاہیے کہ میں یہ نیک کام نہیں کروں گا۔ مثلاً قسم کھا کر یہ کہنا کہ میں فلاں شخص کو کبھی سلام تک نہیں کروں گا یا فلاں شخص سے میں کبھی کلام نہیں کروں گا۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَلَا تَجۡعَلُوا اللّٰہَ عُرۡضَۃً لِّاَیۡمَانِکُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡا وَتَتَّقُوۡا وَتُصۡلِحُوۡا بَیۡنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۲۲۴﴾﴾ (البقرۃ)

’’اور اللہ کے نام کو تختۂ مشق نہ بنالو اپنی قسموں کے لیے کہ بھلائی نہ کرو گے‘ پرہیز گاری نہ کرو گے اور لوگوں کے درمیان صلح نہ کراؤ گے۔ اور اللہ سننے والا‘ جاننے والا ہے۔‘‘

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ادب

ذاتِ باری تعالیٰ کے بعد سب سے اشرف وارفع ذاتِ مبارکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہے۔
ع ’’بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر‘‘۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُقَدِّمُوۡا بَیۡنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۱﴾ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَرۡفَعُوۡۤا اَصۡوَاتَکُمۡ فَوۡقَ صَوۡتِ

النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ (الحجرات)

’’اے اہلِ ایمان! مت آگے بڑھو اللہ اور اُس کے رسول (ﷺ) سے اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے اہل ایمان! اپنی آواز کبھی بلند نہ کرنا نبی (ﷺ) کی آواز پر اور نہ انہیں اس طرح آواز دے کر پکارنا جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو بلند آواز سے پکارتے ہو‘ مبادا تمہارے سارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔‘‘

جب نبی اکرم ﷺ کا نام آئے تو درود پڑھنا چاہیے۔ کوئی بحث مباحثہ ہو رہا ہو اور کسی نے کہا کہ اس معاملے میں حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمان ہے تو بات وہیں ختم ہو جانی چاہیے اور حضور اکرم ﷺ کے فرمان کے مطابق فیصلہ ہو جانا چاہیے۔

نبی اکرم ﷺ کے ادب میں یہ بات بھی شامل ہے کہ آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم‘ آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات‘ آپ ﷺ کی اولاد‘ آپ ﷺ کے رشتہ دار جو ایمان لائے‘ ان سب کا بھی لازماً ادب اور احترام کیا جائے‘ ان کی بھی عزت کی جائے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ایک مرتبہ سخت قحط سالی ہوئی تو آپؓ نے رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے توسط سے دعا کرائی۔ ہمیں چاہیے کہ وقت نکال کر نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مبارکہ کا مطالعہ کریں۔ جتنا زیادہ ہمیں حضور اکرم ﷺ کا اپنی اُمّت پر رحمت و شفقت کا علم ہوگا‘ اور یہ معلوم ہوگا کہ آپ ﷺ اپنی اُمّت کی نجات کے لیے کتنے فکر مند تھے‘ اتنا ہی زیادہ ہم آپ ﷺ سے محبت کر سکیں گے اور دل سے آپ ﷺ کا ادب کریں گے۔

قرآن مجید کا ادب

قرآن کریم اور وہ مجلس جہاں درسِ قرآن ہو رہا ہو یا قرآن کی تلاوت کی جا رہی ہو‘ دونوں کے آداب کا خیال رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝۲۰۴﴾ (الاعراف)

’’اور جب قرآن پڑھا جا رہا ہو تو اسے پوری توجہ کے ساتھ سنا کرو اور خاموش رہا کرو

تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔‘‘

البتہ اگر آپ بازار جا رہے ہیں اور کسی نے تلاوتِ قرآن کی کیسٹ اونچی آواز سے لگائی ہوئی ہے تو اب ادب سے سننا صرف اُسی کے لیے واجب ہے‘ باقی لوگ اس کے سننے کے مکلّف نہیں۔ قرآن مجید کو بے دلی سے نہیں پڑھنا یا سننا چاہیے۔ اس وقت دل و دماغ دونوں کو حاضر رکھنا چاہیے۔ جہاں قرآن مجید کا درس ہو رہا ہو‘ وہاں متوجہ ہو کر سننا بہت ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک طرف تو درسِ قرآن ہو رہا ہو اور دوسری طرف ہم موبائل پر پیغامات بھیج رہے ہوں‘ یا کسی سے فون پر بات کرنے لگ جائیں‘ یا کسی ساتھی سے گفتگو کرنے لگیں۔ یہ تمام باتیں قرآن مجید کی بے ادبی کے زمرے میں آتی ہیں۔

عمر میں بڑوں کا ادب

عمر میں بڑے تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک خاندان کے بزرگ‘ جیسے والدین اور رشتہ دار وغیرہ۔ ان سب کا ادب اور احترام کرنا بہت ضروری ہے‘ خاص طور پر والدین کا۔ ان کے سامنے زبان درازی نہیں کرنا چاہیے۔ وہ اگر بلاوجہ بھی ڈانٹ دیں تو خاموش رہنا چاہیے۔ آگے سے ان کو جواب نہ دیں۔ جوں ہی وہ ملیں‘ انہیں خوش دلی سے مسکرا کر سلام کرنا چاہیے۔ ان کے سامنے ایسی کوئی بات نہیں کرنی چاہیے جس سے وہ اپنی بے عزتی یا بے ادبی محسوس کریں۔

دوسرے پڑوسی یا محلہ دار۔ ان کا بھی ادب کرنا چاہیے۔ انہیں کسی رشتے سے پکارنا چاہیے‘ جیسے چچا یا خالہ۔ ان کی ڈانٹ کو بھی محسوس نہیں کرنا چاہیے اور ان کے سامنے بھی خاموش رہنا چاہیے۔

تیسرے وہ عمر رسیدہ لوگ جو ہمارے گھروں میں ملازم ہیں یا بے چارہ غریب ریڑھی بان‘ چھابڑی لگانے والا‘ ڈرائیور‘ سکیورٹی گارڈ یا جھاڑو دینے والا۔ ان سے بھی تمیز اور شائستگی سے بات کرنی چاہیے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيرَنَا)) (رواہ الترمذی)

’’وہ شخص ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی تعظیم نہ کرے۔‘‘

ہمیں چاہیے کہ ہم خاص طور پر اپنے بچوں کو سکھائیں کہ وہ نوکروں اور ملازموں سے ادب و احترام سے پیش آئیں۔ انہیں ’’آپ‘‘ کہہ کر مخاطب کریں۔ نام لینے کے بجائے چچا یا خالہ کہہ کر

پکاریں۔ ان سے تحکمانہ لہجے میں بات نہ کریں۔ بچوں کو چاہیے کہ وہ نوکروں کو خود سلام کریں‘ اس لیے کہ چھوٹے ہی بڑوں کو سلام کرتے ہیں۔ ملازمین کی بھی عزّتِ نفس ہوتی ہے‘ وہ بھی عزّت چاہتے ہیں۔ یاد رکھیں غریب کی آہ عرشِ الٰہی کو بھی ہلا دیتی ہے۔

علاوہ ازیں علماء کرام اور دینی شخصیات کا بھی ادب کرنا چاہیے‘ خواہ عمر میں چھوٹے ہی کیوں نہ ہوں۔ اگرچہ وہ عمر میں چھوٹے ہیں مگر علم میں بڑے ہیں۔

رتبے اور عہدے میں بڑوں کا ادب

جو عہدے میں بڑا ہو اُس کی بھی عزت کرنی چاہیے‘ کیوں کہ یہ مقام اُسے اللہ تعالیٰ نے عطا کیا ہے۔ مثلاً ملک کا سربراہ‘ ادارے کا سربراہ یا مسجد کا امام وغیرہ۔ البتہ ایسے لوگوں کے غلط کام پر تنقید کی جاسکتی ہے مگر ادب کے دائرہ میں رہ کر۔ اسی طرح کوئی کاروبار کا مالک ہے تو اس کے ملازمین کو بھی اُس کی عزّت کرنی چاہیے۔ ادب میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جو لوگ عمر‘ علم‘ عہدے میں بڑے ہوں ان کا ہرگز مذاق نہیں اڑانا چاہیے۔ آج کل اخباروں میں کسی بھی سیاستدان کا کارٹون بنا کر اس کے نیچے کوئی تبصرہ کر دیا جاتا ہے‘ یا ٹی وی چینلز پر ان کے مزاحیہ کردار بنا کر ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ سوشل میڈیا پر کسی جانور کے سر پر کسی سیاستدان کا سر لگا کر نیچے تبصرہ آجاتا ہے۔ سوشل میڈیا پر تو رواج چل پڑا ہے کہ جو بھی عہدے میں بڑے ہوں ان کے مزاحیہ کردار بنائے جاتے ہیں‘ ان کی کردار کشی کے لیے لطیفے گھڑے جاتے ہیں‘ یہاں تک کہ ننگی گالیاں تک دی جاتی ہیں اور پھر اس سے لطف اندوز ہوا جاتا ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب بے ادبی کرنا دنیا کا رواج بن گیا ہے۔ ہر کسی کی بے ادبی کی جاتی ہے‘ جملے کسے جاتے ہیں۔ جعلی سکینڈلز بنا کر انہیں اچھالا جاتا ہے‘ بدنام کیا جاتا ہے۔ ان سکینڈلز کی پرنٹ اور سوشل میڈیا پر تشہیر کی جاتی ہے‘ یہاں تک کہ ان پر کتابیں بھی لکھ دی جاتی ہیں۔ اصل میں تو یہ مغربی تہذیب ہے اور ہم اس کی نقّالی کرتے چلے جا رہے ہیں۔ انہوں نے تو اپنے پیغمبروں کو بھی نہیں بخشا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسی معزز اور محترم ہستیوں پر یہودیوں نے جھوٹے الزام لگائے۔ دورِ حاضر میں مزاحیہ فلمیں بنائی گئیں۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔

یہ نہ صرف بے ادبی کی بات ہے بلکہ اللہ کے عذاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ شائستگی کے دائرے میں رہ کر بڑوں سے اختلاف کیا جاسکتا ہے اور تعمیری تنقید بھی کی جاسکتی ہے۔

علم ادب کے ساتھ آتا ہے۔ یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ادب علم کے بغیر نہیں آتا۔ علم اور ادب دونوں لازم وملزوم ہیں۔

بڑوں کا ادب کیسے کیا جائے؟

جب بڑے بات کریں تو بیچ میں بات نہ کاٹی جائے بلکہ بات مکمل ہو جانے کے بعد اظہارِ خیال کیا جائے۔ اکثر معمر افراد ٹھہر ٹھہر کر اور دُہرا دُہرا کر بات کرتے ہیں۔ ان کی بات صبر کے ساتھ سنی جائے۔ بات مکمل ہونے کا انتظار کیا جائے۔

مکہ مکرمہ میں ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ کے پاس ولید بن مغیرہ آیا اور اس نے بات شروع کی: بھتیجے! یہ تم نے کیا کیا؟ مکہ کے گھر گھر میں فساد برپا کر دیا! تم نے ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہا! وغیرہ وغیرہ۔ نبی اکرم ﷺ اس سے عمر میں چھوٹے تھے مگر رسول ہونے کے ناطے رتبہ میں سب سے بڑے تھے۔ آپ ﷺ اللہ کے پیارے رسول تھے اور وہ اللہ کا دشمن تھا۔ اس کے باوجود آپ ﷺ نے اس کی بات نہیں کاٹی بلکہ صبر اور خاموشی سے سنتے رہے۔ جب وہ اپنی بات مکمل کر چکا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ابو ولید! آپ کی بات مکمل ہوگئی؟'' اس نے کہا: ''جی ہوگئی۔'' اس کے بعد آپ ﷺ نے اس کی بات کا جواب دیا۔

اسی طرح بچوں کو سکھانا چاہیے کہ وہ بڑوں کی کسی غلطی پر مت ہنسیں۔ انہیں دور سے مخاطب نہ کریں بلکہ قریب جا کر ان سے بات کریں اور شائستگی کے ساتھ نرم لہجے میں گفتگو کریں۔ شریعت کے دائرے کے اندر رہ کر ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ بڑوں کی بات مان لی جائے‘ ان کا کہا مانا جائے۔

علماء اور اساتذہ کا ادب

ایک مرتبہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کسی جنازے میں شرکت فرمائی۔ نمازِ جنازہ سے فارغ ہونے کے بعد ان کی سواری کے لیے ایک خچر لایا گیا تو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فوراً آگے بڑھ کر رکاب تھام لی۔ یہ دیکھ کر حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اے میرے آقا کے ابنِ عم! میری سواری کی رکاب تھام کر آپ تکلیف نہ فرمائیں''۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما آنحضور ﷺ کے چچا زاد بھائی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کا بڑا مقام ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''اطمینان سے بیٹھیے! علماءِ دین کی اس طرح عزت کرنی چاہیے''۔ ایک

مرتبہ خلیفہ ہارون الرشید مدرسہ میں آیا تو دیکھا استاد صاحب وضو کر رہے ہیں۔ شہزادہ لوٹے سے پانی ڈال رہا ہے اور وہ اپنے ہاتھ سے پاؤں مل رہے ہیں۔ خلیفہ ہارون الرشید اپنے بیٹے پر ناراض ہوا اور کہنے لگا کہ ایسا کیوں نہ ہوا کہ تُو ایک ہاتھ سے پانی ڈالتا اور دوسرے ہاتھ سے استاد کا پاؤں دھوتا! یہ ہے ادب کا معیارِ مطلوب اور ہماری اسلامی تہذیب۔

ادب اور حکم میں تصادم

حکم کی بجا آوری اور ادب دونوں بہت ضروری ہیں مگر بعض اوقات دونوں پر بیک وقت عمل ممکن نہیں ہوتا۔ اس صورت میں قانون یہ ہے کہ ''اَلْأَمْرُ فَوْقَ الْأَدَبِ'' یعنی حکم کو ادب پر فوقیت حاصل ہے۔ مثلاً کچھ لوگ کسی بزرگ کا ہاتھ چومنا چاہتے ہیں مگر بزرگ کو پسند نہیں کہ کوئی میرا ہاتھ چومے۔ لہٰذا انہوں نے منع کر دیا تو اب لوگوں کو ان کا ہاتھ چومنے پر اصرار نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارے اسلاف میں تو یہاں تک ہوا ہے کہ کچھ علماء سفر پر جا رہے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک سینئر استاد کو سفر کا امیر بنا دیا۔ راستے میں امیر سفر نے ساتھیوں سے کہا کہ سامان میرے سر پر رکھ دو۔ ان کے ساتھی علماء اس وقت کو کوسنے لگے جب انہوں نے ان استاد صاحب کو اپنا امیر سفر بنایا تھا۔

ایک مرتبہ کوئی دیہاتی مولانا اشرف علی تھانویؒ کے پاس بیعت کرنے آ گیا۔ مولانا کا معمول تھا کہ عام طور پر بہت دیکھ بھال کر بیعت لیا کرتے تھے' بلکہ بڑے بڑے علماء ان سے بیعت کے لیے آتے اور وہ انکار کر دیتے تھے۔ اس دیہاتی سے مولانا نے فوراً بیعت لے لی۔ اس کو بیعت کے تقاضے سمجھائے' کچھ ہدایات دیں اور واپس بھیج دیا۔ کچھ عرصہ بعد وہ دیہاتی ایک گٹھڑی میں مولانا کے لیے کچھ ہدیہ لے کر حاضر ہوا اور کہنے لگا: ''اشرف! اسے کہاں رکھوں؟'' مولانا اُس وقت کچھ لکھنے میں منہمک تھے' اس لیے اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ اس نے دوبارہ' سہ بارہ کہا' مگر مولانا بدستور مصروف رہے۔ آخر جھنجلا کر بولے: ''رکھ دے میرے سر پر!'' اس دیہاتی نے فوراً وہ گٹھڑی ان کے سر پر رکھ دی۔ مولانا اس پر بہت خوش ہوئے اور حاضرین سے کہا: ''دیکھو! اسی وجہ سے مَیں نے اس سے فوراً بیعت لے لی تھی۔'' لہٰذا جو بھی حکم دیا جائے اسے فوراً مان لینا چاہیے خواہ اس سے ادب میں کوئی کمی آ رہی ہو۔ عین ممکن ہے کوئی شاگرد یا ماتحت ادب اور تعظیم کی وجہ سے کوئی کام کر رہے ہوں جب کہ استاد یا امیر اس

کام کی وجہ سے بے اطمینانی محسوس کر رہے ہوں۔ ایسی صورت میں استاد یا امیر جو بھی حکم دے اسے فوراً مان لینا چاہیے۔ بقول زکی کیفی ؎

عشق تسلیم و رضا کے ماسوا کچھ بھی نہیں
وہ وفا سے خوش نہ ہوں تو پھر وفا کچھ بھی نہیں!

قوانین کا احترام

اسلام نے قانون کا ادب کرنے کا حکم بھی دیا ہے۔ جب قانون کا ادب اور احترام ہوگا تو اس کی خلاف ورزی بھی نہیں ہوگی۔ شریعت اللہ کا دیا ہوا قانون ہے اور اس کی بھی حدود ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ادب ہوگا تو اُس کی شریعت کا بھی ادب ضرور ہوگا۔ ایک حدیثِ نبویؐ کا مفہوم کچھ یوں ہے: ''مؤمن اور ایمان کی مثال اُس گھوڑے کی سی ہے جو کہ اپنے کھونٹے سے بندھا ہوا ہے۔ وہ (اپنی رسّی کی حدود میں) گھومتا پھرتا ہے اور پھر (اپنے کھونٹے پر) لوٹ آتا ہے۔ بے شک مؤمن سے خطا ہو جاتی ہے مگر وہ ایمان کی طرف لوٹ آتا ہے۔'' (مسند احمد) مؤمن شریعت کے دائرے کے اندر اندر رہتا ہے' قانون توڑ کر پھلانگتا نہیں ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَ مَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾﴾ (البقرة)

''یہ اللہ کی قائم کردہ حدود ہیں تو انہیں پامال مت کرو۔ اور جو کوئی اللہ کی حدود کو پامال کرے تو یہی لوگ ظالم ہیں۔''

جن لوگوں کے دل میں تکبر ہوتا ہے وہ قوانین کا احترام نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ قانون دوسروں کے لیے ہے' میرے لیے نہیں۔ یا وہ چاہتے ہیں کہ ان کے لیے فلاں فلاں قانون میں تبدیلی کر دی جائے۔ یہ لوگ خود کو قانون سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ درحقیقت قانون بنانے کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے اجتماعیت پیدا ہوتی ہے اور اجتماعی کام آسان ہو جاتے ہیں۔ معاشرہ میں سب کے ساتھ برابری کا سلوک ہوتا ہے۔ قانون کی پابندی سے بہت سی مثبت خوبیاں اُبھرتی ہیں۔ انسان میں اطاعت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ معاملات کو چلانے کے لیے قوانین لازمی ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹے ادارے کے بھی کچھ نہ کچھ قواعد وضوابط ہوتے ہیں۔ اگر قوانین نہ ہوں یا ان پر عمل درآمد نہ ہو رہا ہو تو معاشرے میں امن وسکون کے بجائے تنازع

اور ٹکراؤ کی کیفیت رہتی ہے۔

قانون پر عمل کرنے اور اس کا احترام کرنے سے نظم وضبط پیدا ہوتا ہے۔نماز میں صفوں کی درستی سے اس کی عادت ڈالی گئی ہے۔ جب نبی اکرم ﷺ کا وصال ہوا تو صحابہ کرام ؓ صفیں بنا بنا کر حجرۂ مبارکہ میں جاتے‘ نمازِ جنازہ ادا کرتے اور باہر نکل آتے۔ تمام لوگ منظم اور پُر سکون رہے۔ نہ کوئی ہڑبونگ مچی‘ نہ کوئی دھکم پیل ہوئی اور نہ ہی لوگ پیروں تلے روندے گئے۔

نبی اکرم ﷺ لوگوں سے جو بیعت لیا کرتے تھے اس کے الفاظ نظم وضبط کی بہترین مثال ہیں۔ حضرت عبادہ بن صامت ؓ فرماتے ہیں:

بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ عَلَی السَّمعِ وَالطَّاعَۃِ، فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ، وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ، وَعَلٰی اَثَرَۃٍ عَلَیْنَا، وَعَلٰی اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ، وَعَلٰی اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا،کُنَّا لَا نَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَائِمٍ(متفق علیه)

’’ہم نے بیعت کی رسول اللہ ﷺ سے کہ ہم سنیں گے اور مانیں گے‘ خواہ مشکل ہو یا آسانی‘ خواہ ہماری طبیعت کو اچھا لگے یا برا‘ خواہ دوسروں کو ہم پر ترجیح دی جائے‘ اور جس کو بھی ہم پر امیر بنایا جائے گا ہم اس سے نہیں جھگڑیں گے‘ اور ہم حق کہتے رہیں گے جہاں کہیں بھی ہوں‘ اور اللہ تعالیٰ کے معاملے میں حق کہنے سے ہم ہرگز نہیں ڈریں گے‘ نہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کو خاطر میں لائیں گے۔‘‘

غور کریں کہ ہر نکتہ پر کتنا زور ہے۔ دل چاہے یا نہ چاہے‘ چاہے خوش اور راضی ہوں چاہے ناخوش اور ناراض ہوں‘ مشکل ہو یا آسانی‘ ہم ہر حال میں اطاعت کریں گے۔

جب انسان اس طرح اپنے آپ کو قواعد وضوابط کی اطاعت اور پیروی کا عادی بنا لیتا ہے تو مشکلات اور دقت کے باوجود وقت پر کام کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام ؓ کی عظیم الشان فتوحات جن کے نتیجہ میں دین غالب ہو گیا تھا‘ اسی تنظیم اور اطاعت کی بدولت حاصل ہوئیں۔

اسلام نہیں چاہتا کہ مسلمانوں کا مزاج اعتراض والا ہو۔ ہمیں قانون کی اصلاح کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لینی چاہیے۔ قانون کی اصلاح کرنا اصحابِ امر کا کام ہے۔ قانون پر تنقید کرنا بھی بے ادبی کا ایک مظہر ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ وَ اِذَا کَانُوۡا مَعَہٗ عَلٰۤی اَمۡرٍ جَامِعٍ لَّمۡ یَذۡہَبُوۡا حَتّٰی یَسۡتَاۡذِنُوۡہُ ؕ ﴾ (النور:٦٢)

’’بے شک مومن تو صرف وہ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور اُس کے رسول (ﷺ) پر اور جب ان کے ساتھ کسی اجتماعی معاملہ میں ہوں تو جب تک اجازت نہ ملے‘ وہاں سے نہیں جاتے۔‘‘

یعنی اگر غیر معمولی صورتحال پیدا ہوگئی ہو تو آپ ﷺ سے اجازت لے کر جاتے ہیں‘ بغیر اجازت کے نہیں جاتے۔

جب انسان اطاعت کو اپنی عادت بنا لیتا ہے تو یہ انسان کو کڑے وقت اور آزمائش کے موقع پر بھی سنبھال لیتی ہے۔ سیرت النبی ﷺ میں اس کا مظاہرہ صلح حدیبیہ کے موقع پر ملتا ہے۔ صلح حدیبیہ کی شرائط سے صحابہ کرام ؓ بالکل خوش نہیں تھے لیکن چونکہ اطاعت اور نظم وضبط کے خوگر ہو چکے تھے‘ لہٰذا اس کٹھن وقت میں بھی اطاعت پر کاربند رہے۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ اِذۡ جَعَلَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فِیۡ قُلُوۡبِہِمُ الۡحَمِیَّۃَ حَمِیَّۃَ الۡجَاہِلِیَّۃِ فَاَنۡزَلَ اللّٰہُ سَکِیۡنَتَہٗ عَلٰی رَسُوۡلِہٖ وَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ اَلۡزَمَہُمۡ کَلِمَۃَ التَّقۡوٰی وَ کَانُوۡۤا اَحَقَّ بِہَا وَ اَہۡلَہَا ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمًا ﴿۲۶﴾ ﴾ (الفتح)

’’جب ان کافروں نے اپنے دلوں میں حمیت بٹھالی‘ جاہلیت کی حمیت‘ تو اللہ نے سکینت نازل کر دی اپنے رسول (ﷺ) پر اور اہلِ ایمان پر‘ اور اُس نے لازم کر دیا ان پر تقویٰ کی بات کو اور وہ اس کے زیادہ حق دار بھی ہیں اور اس کے اہل بھی ہیں۔ اور اللہ ہر چیز کا خوب علم رکھنے والا ہے۔‘‘

اسی اطاعت کے جذبہ کی وجہ سے صحابہ کرام ؓ تقویٰ اور احسان کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوئے۔ درحقیقت تقویٰ بھی قانون کی اطاعت کے بغیر نہیں حاصل ہو سکتا۔

ادب اور احترام

عام طور پر ادب اور احترام کو مترادف سمجھ لیا جاتا ہے لیکن ان دونوں الفاظ کے مفہوم میں تھوڑا سا فرق ہے۔ ’’احترام‘‘ کا لفظ حرمت سے بنا ہے‘ جس کا مطلب ہے کہ کسی چیز کی عظمت کی وجہ سے اُس کی تعظیم کرنا۔ اگر کسی کے لیے دل کے اندر عزّت اور احترام ہے تو خود بخود تعظیم

ہوگی۔ اصل ادب بھی یہی ہے کہ دل میں احترام ہو اور جسم کی حرکات وسکنات سے بھی اس کا اظہار ہو رہا ہو‘ نہ کہ دکھاوا اور بناوٹی عزّت واحترام۔ البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان ہر ایک کا دل سے احترام نہیں کرسکتا۔ جن لوگوں کا ادب کرنے کا تقاضا ہوتا ہے‘ بعض اوقات دل میں ان کا احترام نہیں ہوتا۔ ایسے وقت میں بھی انسان کو مناسب رویّہ اختیار کرنا چاہیے۔ دل میں اگر احترام نہیں ہے تو بھی کم ازکم رویّہ سے اس کا اظہار نہیں ہونا چاہیے۔

مثال کے طور پر مہمانوں کا ادب اور حق یہ ہے کہ خوش دلی سے ان کا استقبال کیا جائے‘ انہیں ادب کے ساتھ بٹھایا جائے‘ ان کی خاطر تواضع کی جائے۔ اگر کچھ ایسے لوگ آجائیں جن کو ہم پسند نہیں کرتے‘ ان کی کچھ بری عادتوں کی وجہ سے ہمارے دل میں ان کا احترام نہیں ہے تب بھی ظاہراً ان کا ادب کرنا چاہیے۔ ان کا مسکرا کر استقبال کرنا چاہیے۔ جب انسان اس طرح سے ہر ایک کا ''ادب'' اور ''احترام'' کرنا سیکھ لیتا ہے تو زندگی میں کسی بھی مزاج کے لوگوں کے ساتھ رہنا آسان ہوجاتا ہے۔ بعض اوقات لڑکیوں کو سسرال میں ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے جن کی عادات اچھی نہیں ہوتیں۔ ایسے وقت میں انہیں والدین کی دی ہوئی تربیت ہی کام آتی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنا رویّہ مناسب رکھ کر بہت سی تلخیوں سے بچ سکتی ہیں۔

آج کل ادب اور احترام کا معیار بدل گیا ہے۔ بے ادبی کو خوداعتمادی کا نام دے دیا گیا ہے۔ ایسے میں تمام معاملات تلپٹ ہو کر رہ گئے ہیں۔ بچے بڑوں کے سامنے بدتمیزی کرتے ہیں۔ منہ پھٹ بچوں کو حاضر جواب کہہ کر ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ والدین خوش ہوتے ہیں کہ ہمارا بچہ بہت بااعتماد اور بولڈ ہے۔ ادب کرنا بے چارگی‘ بزدلی یا کمزوری کی علامت بنادیا گیا ہے‘ جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں۔ ادب وہی لوگ کرتے ہیں جو اندر سے بااعتماد ہوتے ہیں‘ ورنہ زبان تو سب کے پاس ہے اور زبان چلانا بھی کوئی بہت بڑی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ادب اور احترام کا خوگر بنائے۔ آمین یاربّ العالمین!

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

غزوۂ ہند کے بارے میں ارشاداتِ نبوی ﷺ

طارق محمود ہاشمی ☆

مقدّمات

احادیثِ مقدسہ میں رسول اللہ ﷺ کی لسانِ مبارک سے مستقبل کے بارے میں پیش گوئیاں روایت ہوئی ہیں۔ ان کے بارے میں چند مقدمات پیشِ نظر رہنے چاہئیں:

ایک‘ یہ روایات مستقبل (یعنی عالمِ غیب) کے بارے میں آپ ﷺ کی دی ہوئی اطلاعات ہیں۔ ایسی اطلاعات ہمارے پاس قرآن مجید کے علاوہ واحد ذریعۂ علم ہیں‘ اس لیے نہایت قیمتی ہیں۔ ان اخبار کا مقصد اُمّت کو خبردار کرنا تھا‘ اور ان میں بتائے گئے امور کے لیے تیار رہنے کی تحریض تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُمّت نے ہمیشہ اِنہیں اہمیت دی ہے۔

دوسرے‘ مستقبل کے واقعات میں زمان کی تعیین بالعموم مجمل ہوتی ہے۔ دن‘ تاریخ اور سال کی تعیین نہیں ہوتی‘ بلکہ محدثین کا اصول ہے کہ جس حدیث میں تمام واقعات بقیدِ وقت‘ تاریخ‘ دن‘ مہ و سال بیان ہوں‘ وہ معرضِ شک میں ہے۔ علامہ ملا علی قاری حنفیؒ نے ''الاسرار المرفوعة فی الاخبار الموضوعة '' میں اس اصول پر تفصیلی بحث کی ہے اور متعدد مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ مستقبل کے بارے میں وہ اخبار جن میں اس طرح کی قید اور تعیین ہو‘ قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔ (۱)

تیسرے‘ اس قسم کی اخبار کی صحت جاننے کے اصول جرح و تعدیل کے روایتی اصول ہی ہوں گے۔ یعنی ہر روایت کے ردّ و قبول کا فیصلہ اُس کی اسناد پر کیا جائے گا۔ لہٰذا اس باب کی تمام روایات کو کوئی طبع زاد اصول وضع کر کے مجموعی طور پر مسترد نہیں کیا جا سکتا‘ بلکہ انفرادی اسناد کی تحقیق پر فیصلہ کیا جائے گا۔ لہٰذا فتن‘ ملاحم اور اماراتِ آخرت کے بارے میں منکرینِ حدیث کا عمومی انکار بلادلیل ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کا ایک قول اس سلسلے میں عموماً پیش کیا جاتا ہے کہ آپ

☆ نائب مدیر سہ ماہی ''حرفِ نیم گفتہ''‘ لاہور

نے فرمایا: ’’تین کتب کی کوئی اصل نہیں۔ ملاحم‘ مغازی اور تفسیر۔‘‘ حضرت امامؒ کے اس قول کی وضاحت خطیب بغدادیؒ اور بعد کے علماء نے فرمائی ہے۔ امام صاحبؒ کی مراد یہ ہے کہ ان اصناف میں تمام روایات نبی ﷺ سے مروی نہیں ہیں بلکہ ان اخبار کی اکثریت صحابہ کرام ؓ یا ان کے تابعین باحسان سے مروی ہے‘ یعنی مُرسل ہیں‘ گو یہ وہ مُرسل نہیں جس کی تکنیکی تعریف متاخرین نے کی ہے۔ اس پر خطیب بغدادیؒ کا کلام وقیع ہے۔ فرماتے ہیں کہ امام صاحب تین متعین کتب‘ یا اصنافِ کتب کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں کیونکہ امام احمدؒ کے الفاظ ہیں: ’’ثَلَاثُ كُتُبٍ لَيسَ لَهَا أُصُولٌ : الْمَغَازِي وَالْمَلاحِمُ وَالتَّفْسِيرُ‘‘(۲)۔ خطیب بغدادیؒ نے اس قول کو نقل کر کے لکھا ہے:

وَهٰذَا الْكَلَامُ مَحْمُولٌ عَلٰى وَجْهٍ وَهُوَ أَنَّ الْمُرَادَ بِهِ كُتُبٌ مَخْصُوصَةٌ فِي هٰذِهِ الْمَعَانِي الثَّلَاثَةِ غَيْرُ مُعْتَمَدٍ عَلَيْهَا وَلَا مَوْثُوقٍ بِصِحَّتِهَا لِسُوءِ أَحْوَالِ مُصَنِّفِيهَا وَعَدَمِ عَدَالَةِ نَاقِلِيهَا وَزِيَادَاتِ الْقُصَّاصِ فِيهَا(۳)

’’اس قول کی ایک خاص توجیہہ ہے‘ جو یہ ہے کہ اس سے مراد ان تین معاملات پر لکھی گئی مخصوص کتب ہیں جو قابلِ اعتماد نہیں ہیں اور ان کی صحت موثوق نہیں ہے‘ کیوں کہ ان کے مصنّفین کے حالات اور ان کے ناقلین کی عدالت اچھی نہیں۔ اس کے علاوہ قصہ گو لوگوں نے ان میں اضافے بھی کیے ہیں۔‘‘

خطیب بغدادیؒ مزید فرماتے ہیں کہ امام احمدؒ کی مراد یہ ہے کہ اُن کے دور میں تین علوم میں مؤلفہ کتب میں اکثر روایات مُرسل ہیں۔ ان میں بہت سی اخبارِ باطلہ بھی ہیں جو ’’واہی‘‘ اسناد سے روایت کی گئی ہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ تفسیر‘ مغازی اور ملاحم میں احادیث و آثار سب غیر صحیح ہیں۔ یہ تعبیر امام صاحبؒ کی مراد سے بہت بعید ہے‘ کیونکہ بے شک ان علوم میں کثیر تعداد میں صحیح روایات موجود ہیں‘ اور خود امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی ’’مسند‘‘ میں ان علومِ ثلاثہ کے ضمن میں صحیح روایات و آثار روایت فرمائے ہیں‘ انتہیٰ۔

چوتھے‘ ان اخبار میں صحت کے اسنادی معیارات کے علاوہ ایک اور معیار بھی ہے: خبر کا واقع ہو جانا۔ یعنی جس واقعے کی ضعیف ذریعے سے بھی خبر ملی‘ وہ عملاً واقع ہو گیا‘ تو کیا اب بھی انکار کیا جائے گا؟ نبی ﷺ سے مستقبل کے حوادث و واقعات کے بارے میں بہت سی احادیث مروی ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ نبی ﷺ غیب کے امور کو وحی پانے کے بعد بیان

فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کے بارے میں قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ آپؐ ہوائے نفس سے بات نہیں کرتے ﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى ③﴾ (النجم) ۔ اس آیت کا ایک مستفاد یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کے ارشادات وحی پر مبنی ہوتے ہیں اور حق کے خلاف نہیں ہوتے۔ لہٰذا آپ ﷺ نے جو اخبار مستقبل کے حوادث اور واقعات کے بارے میں دی ہیں‘ ان میں بہت سے ماضی میں ہی ظاہر ہو چکے۔ اپنی اصل میں وہ اخبار آحاد تھیں جن کی روایت میں صدق و کذب کا احتمال تھا‘ مگر وقوع کے بعد ان کے حتمیت ثابت ہوگئی۔ اسی طرح وہ روایات جو ان واقعات کے بارے میں ہیں جو ابھی تک وقوع پزیر نہیں ہوئے‘ ان سے جڑے رہنا ضروری ہے۔ انہیں اخبار آحاد کہہ کر نا قابلِ اعتناء قرار دینا مبنی بر جہالت ہے۔

پانچویں‘ خبر کی صحت ایک شے ہے اور اس میں مجمل کی تعیین دوسری بات ہے۔ اس قسم کی اخبار میں صحت کے بارے میں فیصلہ معروضی ہوتا ہے‘ اور ان کی تعبیر روایت پر مبنی ہے‘ یعنی اُمّت کے مجموعی فہم کے مطابق۔ لہٰذا جن اخبار کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا وہ وقوع پذیر ہوچکیں یا نہیں‘ اور یہ اختلاف تعبیر کا ہے‘ تو اس بنیاد پر نبی ﷺ کی دی ہوئی کسی ایسی خبر کو قطعیت کے ساتھ غیر متعلق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ تصوّر کر کے کسی خبر کو اس عہد سے غیر متعلق کر دینا‘ کہ اس میں بیان کردہ واقعہ پہلے ہی رونما ہو چکا ہے‘ تعبیری اختلافات کی موجودگی میں بے جا تحکم ہوگا۔

چھٹے‘ اسلام کی خاصیت یہ ہے کہ وہ مسلمانوں میں یہ جذبہ پیدا کرتا ہے کہ تاریخ‘ حال اور مستقبل‘ تینوں میں مرادِ رسول ﷺ کو تلاش کرنے‘ سمجھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ جذبہ ہماری تہذیب کے قلب میں جاگزیں ہے اور اس کی بنیاد‘ ماخذ اور سرچشمہ ہمارا رسوخ فی الدین ہے۔ اس جذبہ و رجحان کے خلاف شکوک پیدا کرنا یا اس کی تحقیر و تخفیف کرنا مسلمان کے شایانِ شان نہیں۔

غزوۂ ہند کے بارے میں احادیث

استعماری منکرینِ حدیث نے بلا دلیل غزوۂ ہند کی روایات کا علی الاطلاق انکار کیا ہے[4]۔ حدیث کے بارے میں اُن کا عمومی طریقہ کار یہ ہے کہ یا تو ’’عقل عام‘‘ کی روشنی میں روایت کی تردید کر دی جائے‘ یا کسی مخصوص طریق کے رُوات پر فن رجال کے اصولوں کا الل ٹپ

اطلاق کر کے اس باب کی تمام روایات کا انکار کر دیا جائے۔ اس طرح متجدّ دین روایت کے کسی ایک طریق کی اسناد میں کیڑے نکال کر روایت کو بظاہر اسلامی روایت ہی سے مدد لے کر مجروح قرار دیتے ہیں‘ خواہ ان کی تنقید کا شکار بننے والی روایت متعدد مستند مراجع سے آئی ہو‘ اس کے طُرق کثیر ہوں‘ روایت مسلمانوں کے متنوع علوم میں مقبول ہو‘ علماء کی بحثوں میں بار بار ظاہر ہوتی ہو‘ اور مختلف طریقوں سے استناد پا کر تواترِ معنوی کا درجہ پا چکی ہو۔ منکرینِ حدیث کسی خاص روایت پر بحث کے دوران اس کے تعدد مراجع کو دیکھتے ہیں‘ اس کے کثیر طرق کی طرف ان کی نظر جاتی ہے‘ اور نہ وہ اسے مجموعی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ اسلامی علوم بالخصوص فن رجال کا یہ سوئے استعمال فن سے عدم واقفیت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے اور غزوۂ ہند کے موضوع پر متجد دین کا کلام اسلامی روایت سے ان کی بے اعتنائی کی مثال ہے۔ یہ مضمون متجد دین کے دلائل سے براہِ راست تعارض کرنے کی بجائے یہ واضح کرنے کی کوشش ہے کہ غزوۂ ہند پر وارد ہونے والی بعض روایات کا ضعف ان کی اسناد‘ تعددِ طُرق‘ اور قبولیت عام کی وجہ سے دور ہو جاتا ہے۔ اس بحث سے یہ بھی واضح ہو گا کہ اس موضوع پر وارد روایات اور ان کے طرق کو الگ الگ کر کے عقل عام پر مبنی مبتدعانہ اصولوں اور محدثین کے اقوال کے سوئے استعمال سے مسترد کرنا کسی صورت بھی درست نہیں ہے۔

غزوۂ ہند کی روایات کے مضامین

غزوۂ ہند کی روایات میں مندرجہ ذیل باتیں بیان ہوئی ہیں:

(الف) مستقبل میں ایک جنگ ہو گی جسے رسول اللہ ﷺ نے ”غزوۂ ہند“ کا عنوان دیا ہے۔ اس واقعے کی کوئی تاریخ یا ماہ و سال حدیث میں بیان نہیں ہوئے۔ لہٰذا‘ اسے اس بنیاد پر مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں زمانے کی تعیین ہو گئی ہے۔ البتہ اس اجمال کے سبب‘ یہ بھی متعین نہیں کیا جا سکتا کہ یہ جنگ کب ہو گی۔ اس وجہ سے جن علماء نے ماضی میں گزرے کچھ واقعات پر اس پیش گوئی کا انطباق کیا ہے‘ وہ ایک تعبیر ہی ہے‘ اور ایسی کسی تعبیر کو حتمی قرار دے کر نبی ﷺ کے فرمان کو مستقبل سے غیر متعلق نہیں کیا جا سکتا۔

(ب) اس جنگ میں شرکت مسلمانوں کے لیے غیر معمولی اجر کا باعث ہو گی‘ بلکہ اس کے اجر کو اُن لوگوں کے اجر کے مماثل بتایا گیا ہے جو حضرت مسیح بن مریم علیہ السلام کے ساتھ مل کر دجال سے جنگ

کریں گے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غزوۂ ہند بہت اہم جنگ ہوگی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اس جنگ میں شرکت کے آرزومند تھے‘ جس سے اس جنگ میں شرکت کے فضائل کا اندازہ ہوتا ہے۔

(ج) جنگ کا نتیجہ کیا ہوگا‘ اس کی صراحت روایات میں نہیں کی گئی۔ یہ درست ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کی آرزو رکھتے تھے کہ وہ بھی اس جنگ میں شریک ہوں‘ اور اس کی حسرت رکھتے تھے کہ لڑتے ہوئے شہید ہوجائیں‘ لیکن فتح کی صراحت نہیں ہے۔ تاہم‘ یہ نکتہ اہم ہے کہ روایات میں غزوۂ ہند کو حضرت مسیح بن مریم علیہ السلام کے اُس جہاد کے مماثل قرار دیا گیا ہے جو آپؑ دجال کے خلاف کریں گے۔ چونکہ دجال کے خلاف جنگ میں حضرت مسیح بن مریم علیہ السلام کو اور ان کے مسلمان متبعین ہی کو فتح نصیب ہوگی‘ لہٰذا یہ قرین قیاس ہے کہ غزوۂ ہند میں بھی مسلمان ہی فتح مند ہوں گے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ’’وَعَدَنَا‘‘ [نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم سے وعدہ فرمایا] کے الفاظ ہیں۔ وعدہ جب مطلق استعمال ہو تو اسے ایک مثبت اور محبوب امر پر محمول کرنا اولیٰ ہے۔ جو امور عموماً مرغوب نہیں ہوتے ان کے لیے تخویف اور ترہیب کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اس میں بھی اشارہ ہے کہ مسلمان اس جنگ میں ظفر مند ہوں گے۔

روایات کا جائزہ

غزوۂ ہند کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے چار روایات مروی ہیں:

(۱) روایتِ ثوبان رضی اللہ عنہ

(۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی پہلی روایت جس کے تین طُرق ہیں۔

(۳) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت

(۴) روایتِ حضرت کعب الاحبار رحمۃ اللہ علیہ

لہٰذا غزوۂ ہند کے بارے میں وارد چار احادیث کے کُل چھ طُرق ہیں۔ ذیل میں ان کی اسانید اور ان کے درجۂ صحت کا ایک مختصر جائزہ پیش ہے:

پہلی حدیث: حدیثِ ثوبان رضی اللہ عنہ

یہ حدیث مبارکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آزاد کردہ غلام‘ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ‘ نے روایت کی ہے۔ سنن نسائی میں حدیث کا متن یہ ہے:

قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم : عِصَابَتَانِ مِنْ أُمَّتِي أَحْرَزَهُمَا اللّٰهُ مِنَ النَّارِ:

عِصَابَةٌ تَغْزُو الْهِنْدَ، وَعِصَابَةٌ تَكُونُ مَعَ عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ عَلَيْهِمَا السَّلَام

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری اُمت کے دو گروہ اللہ تعالیٰ نے آگ سے محفوظ کر دیے۔ ایک وہ گروہ جو ہند پر حملہ کرے گا اور ایک وہ جو حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے ہمراہ ہوگا۔''(۵)

یہ حدیث صحیح ہے۔ علامہ ناصر الدین البانیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام نسائیؒ، امام احمدؒ اور ابوعروبہ حرانیؒ نے درج ذیل سند سے روایت کیا ہے:

عَنْ بَقِيَّةَ بْنِ الْوَلِيدِ، حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ سَالِمٍ وَأَبُو بَكْرِ بْنُ الْوَلِيدِ الزُّبَيدِی، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْوَلِيدِ الزُّبَيدِی، عَنْ لُقْمَانَ بْنِ عَامِرٍ الْوُصَابِي، عَنْ عَبْدِ الْأَعْلَى بْنِ عَدِی الْبَهْرَانِي، عَنْ ثَوْبَانَ مَوْلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ عَنِ النَّبِی ﷺ

میرا موقف یہ ہے کہ یہ سند جید ہے۔ اس سند میں ایک راوی ابوبکر زبیدی مجہول الحال ہیں، مگر اسی سند میں ان کے ساتھ عبداللہ بن سالم اشعری حمصی بھی روایت کر رہے ہیں جو ثقہ ہیں اور صحیح بخاری کے رجال میں سے ہیں۔ اسی طرح بقیۃ بن ولید مدلس ہیں، مگر انہوں نے اس اسناد میں [حدثنا کہہ کر] تحدیث کی تصریح کر دی ہے۔ لہٰذا یہ اسناد ان کی تدلیس کے اثر سے مامون ہوگئی ہے۔ مزید برآں، ایک دوسری سند میں ان کی متابعت بھی ہوگئی۔ یہ متابع روایت ابن عدی اور ابن عساکر اس اسناد سے لائے ہیں:

فَقَالَ هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ: حَدَّثَنَا الْجَرَّاحُ بْنُ مَلِيحِ الْبَهْرَانِي، حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْوَلِيدِ الزُّبَيدِی بِهِ

یہ سند متابعات میں مقبول ہے۔ جراح بن ملیح حمصی صدوق ہیں۔ ہشام بن عمار امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ ہیں۔ یہ تلقین قبول کرلیا کرتے تھے(۶)، مگر یہاں ان کی متابعت بھی موجود ہے۔ امام بخاریؒ کی ''التاریخ الکبیر'' میں سلیمان بن عبد الرحمٰن بن بنت شرحبیل ان کی متابعت کر رہے ہیں۔ بخاری کی سند یہ ہے:

سُلَيمَان (ابْنَ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنَ بِنْتِ شُرَحْبِيلَ) حَدَّثَنَا الْجَرَّاحُ بْنُ مَلِيحٍ حَدَّثَنَا الزُّبَيدِی عَنْ لُقْمَانَ بْنِ عَامِرٍ عَنْ عَبْدِ الْأَعْلَى بْنِ عَدِی الْبَهْرَانِي، عَنْ ثَوْبَانَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ

لہٰذا میں کہتا ہوں کہ یہ قوی سند ہے، اور یہ حدیث شریف صحیح ہے۔ والحمد للہ۔(۷)

دوسری حدیث: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی پہلی روایت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث کے تین طُرق ہیں:

طریق اوّل: جبر بن عَبِیدة رحمہ اللہ عن ابی ھریرة رضی اللہ عنہ

حَدَّثَنِي مُحَمَّدُ بْنُ إِسْمٰعِيلَ بْنِ إِبْرَاهِيمَ' قَالَ: حَدَّثَنَا يَزِيدُ' قَالَ: أَنْبَأَنَا هُشَيْمٌ' قَالَ: حَدَّثَنَا سَيَارٌ أَبُو الْحَكَمِ' عَنْ جَبْرِ بْنِ عَبِيدَةَ' عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ' قَالَ: وَعَدَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ غَزْوَةَ الْهِنْدِ' فَإِنْ أَدْرَكْتُهَا أُنْفِقْ فِيهَا نَفْسِي وَمَالِي' وَإِنْ قُتِلْتُ كُنْتُ أَفْضَلَ الشُّهَدَاءِ' وَإِنْ رَجَعْتُ فَأَنَا أَبُو هُرَيْرَةَ الْمُحَرَّرُ

''ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ ﷺ نے ہم سے غزوۂ ہند کا وعدہ فرمایا۔ اگر مَیں [یعنی ابوہریرہؓ] نے اس غزوے کو پالیا تو میں اس میں اپنا مال اور جان خرچ کر دوں گا۔ اگر میں اس میں قتل ہوگیا' تو پھر میں افضل الشہداء میں شامل ہونے کی سعادت پاؤں گا اور اگر میں [سلامتی سے] واپس آ گیا تو میں [آگ سے] مامون ہوؤں گا۔''(۸)

حدیث کے مندرجہ بالا طریق جبر بن عبیدہ عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کی صحت پر محدثین کا اختلاف ہے' مگر یہ روایت معتبر ہے۔ اگرچہ شعیب ارنؤوط نے اسے ضعیف قرار دیا ہے' احمد محمد شاکر نے بدلائل اس کی صحت ثابت کی ہے(۹)۔ شعیب ارنؤوط نے مسند احمد پر اپنی تعلیقات میں لکھا ہے کہ یہ حدیث جبر بن عبیدةؒ سے سیار بن حکم کے علاوہ کسی اور نے روایت نہیں کی' اور ابن حبانؒ کے علاوہ جبر بن عبیدة کو کسی اور محدث نے ثقہ قرار نہیں دیا۔ شعیب ارنؤوط نے امام ذہبی رحمہ اللہ کا درج ذیل قول نقل کیا ہے:

[اتى] عن أبي هريرة بخبرٍ منكرٍ لا يعرف مَن ذا' وحديثه: وُعِدنا بغزوة الهند!

''[جبر] ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک ہی روایت کرتے ہیں' جو منکر ہے۔ معلوم نہیں یہ کون صاحب ہیں۔ حدیث یہ ہے: وُعِدَنَا بِغَزْوَةِ الْهِنْدِ۔''(۱۰)

اس کے بعد ارنؤوط اس حدیث کے دیگر دو طُرق کی طرف اشارہ کرتے ہیں (جن کا ذکر آگے آرہا ہے)' اور اُن میں ضعف کا ذکر کرتے ہیں۔ آخر میں لکھتے ہیں:

''ہماری رائے ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے قول 'وَعَدَنَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ

غَزْوَۃَ الْهِنْدِ'' کو حضرت ثوبان ؓ کی ایک روایت مؤکد کرتی ہے۔ اس تائیدی روایت کو احمد بن حنبل' نسائی' ابن عدی' اور بیہقی (ؒ) نے روایت کیا ہے۔ حضرت ثوبان ؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں: عِصَابَتَانِ ---۔ الحدیث۔ مگر اس حدیث میں بھی ایک ضعف ہے۔''(۱۱)

جس حدیث کی طرف شعیب ارنؤوط اشارہ کر رہے ہیں' اس کے بارے میں پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ وہ صحیح ہے۔ اگر علامہ کو اس شاہد کی صحت کا استحضار ہوتا تو وہ زیر بحث حدیث کو ضعیف قرار نہ دیتے۔

اس کے برخلاف' احمد محمد شاکرؒ نے مسند احمد ہی پر اپنی تعلیقات میں واضح کیا ہے کہ یہ اسناد صحیح ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

إِسْنَادُهُ صَحِيحٌ [---] جَبْرِ بْنِ عَبِيدَةَ: هُوَ الشَّاعِرُ' وَهُوَ تَابِعِي ثِقَةٌ' تَرْجَمَهُ الْبُخَارِي فِي الْكَبِيرِ فَلَمْ يَذْكُرْ فِيهِ جَرْحًا' وَابْنُ أَبِي حَاتِمٍ فَلَمْ يَجْرَحْهُ أَيضاً' وَذَكَرَهُ ابْنُ حِبَانٍ فِي الثِّقَاتِ. وَزَعَمَ الذَّهْبِي فِي الْمِيزَانِ أَنَّهُ أَتَى "بِخَبَرٍ مُنْكَرٍ' لَا يُعْرَفُ مَنْ ذَا!' وَحَدِيثُهُ: وُعِدَنَا بِغَزْوَةِ الْهِنْدِ!"' وَكَذَالِكَ نَقَلَ الْحَافِظُ فِي التَّهْذِيبِ عَمَّا قَرَأَ بِخَطِّ الذَّهْبِي وَلَسْتُ أَدْرِي مِمَّ جَاءَ لِلذَّهْبِيِّ نُكْرُ الْخَبَرِ؟ وَلَمْ يُنْكِرْهُ الْبُخَارِي وَلَا غَيْرُهُ مِنْ قَبْلِهِ' وَلَمْ يَجْرَحُوا هَذَا التَّابِعِي بِشَيْءٍ!' مَا هُوَ إِلَّا التَّحَكُّمُ. [---] وَالْحَدِيثُ رَوَاهُ الْحَاكِمُ فِي الْمُسْتَدْرَكِ مِنَ الْمُسْنَدِ' مِنْ طَرِيقِ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَحْمَدَ عَنْ أَبِيهِ' بِهٰذَا الْإِسْنَادِ. وَلَمْ يَتَكَلَّمْ عَلَيهِ هُوَ وَلَا الذَّهْبِي. وَرَوَاهُ النِّسَائِيُ' مِنْ طَرِيقِ زَيدِ بْنِ أَبِي أُنَيسَةَ عَنْ سَيارٍ' وَمِنْ طَرِيقِ هُشَيمٍ عَنْ سَيارٍ' بِنَحْوِهِ

''اس کی سند صحیح ہے۔ [---] جبر بن عَبِیدۃ شاعر ہیں۔ یہ تابعی ہیں اور ثقہ ہیں۔ امام بخاریؒ نے الکبیر میں ان کا ترجمہ لکھا ہے اور ان پر کسی جرح کا ذکر نہیں کیا۔ ابن ابی حاتمؒ نے بھی اپنے ترجمے میں ان پر کوئی جرح نہیں کی۔ ابن حبانؒ انہیں ثقات میں شمار کرتے ہیں۔ ذہبیؒ نے ''المیزان'' میں کہا ہے کہ ان ''[جبر] سے ایک ہی روایت مروی ہے' جو منکر ہے۔ معلوم نہیں یہ کون صاحب ہیں۔ اور ان کی حدیث یہ ہے: وعدنا بغزوۃ الھند۔'' اسی طرح حافظ [ابن حجرؒ] نے ''التھذیب'' میں ذہبیؒ کی تحریر کی بنیاد پر اسی

بات کا ذکر کیا ہے (یعنی: لَا یُعْرَفُ مَنْ ذَا!)۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس خبر کے منکر ہونے کی بات ذہبیؒ نے کیسے کی۔ ان سے پہلے تو اس خبر کو کسی نے بھی منکر نہیں کہا؟ نہ امام بخاریؒ نے نہ ان سے قبل کسی اور نے۔ نہ انہوں نے اس تابعی پر کوئی جرح کی۔ لہٰذا [ذہبی کی] یہ بات تحکم کے سوا کچھ نہیں! [---] اس حدیث کو حاکمؒ نے مستدرک میں المسند کے ذریعے عبداللہ بن احمدؒ اور ان کے والد کی سند سے نقل کیا ہے۔ نہ حاکم نے نہ ہی ذہبیؒ نے اس مقام پر اس حدیث پر کوئی کلام کیا۔ اس حدیث کو نسائیؒ نے بھی زید بن ابی اُنَیسۃ کے واسطے سے سیار سے روایت کیا ہے۔ اس کے علاوہ نسائیؒ ہی نے اس روایت کو ہشیم عن سیار سے نقل کیا ہے۔''(۱۴)

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ علامہ ابن حجرؒ نے جبر بن عَبیدۃ کے بارے میں لکھا ہے: ''جَبْر بن عَبِیدَۃَ بِفَتْحِ الْعَینِ وَیقَالُ جُبَیرُ ابْنُ عَبْدَۃَ شَاعِرٌ مَقْبُوْلٌ مِنَ الرَّابِعَۃ۔'' اس سے واضح ہے کہ وہ جبر بن عبیدۃ کو مقبول قرار دے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ احمد عبدالرحمٰن البنا ساعاتیؒ نے بھی سنن نسائی کی روایت کا ذکر کر کے کہا ہے کہ اس کی سند جید ہے (وَسَنَدُہٗ جَیِّدٌ)۔

علامہ ناصرالدین البانیؒ نے جبر بن عبیدہ عن ابی ہریرہؓ کی روایت وعدنا غزوۃ الھند کو ''ضعیف الاسناد'' قرار دیا ہے، لیکن انہوں نے اس کی وجہ بیان نہیں کی۔(۱۵) ممکن ہے کہ اس حکم کی وجہ بھی البانی کی نظر میں جبر بن عبیدۃ کا مجہول ہونا ہو۔ البتہ ضعف کا یہ حکم اس لیے محل نظر ہے کہ ابن ابی حاتمؒ اور امام بخاریؒ نے جبر بن عبیدہ پر جرح نہیں کی، جیسا کہ اوپر احمد شاکر کے حوالے سے بیان ہوا۔ ابن حبانؒ کے نزدیک وہ ثقہ ہیں، اور ابن حجرؒ نے انہیں مقبول لکھا ہے۔ لہٰذا، احمد شاکر کا تجزیہ قرین قیاس ہے کہ یہ سند جید ہے۔

اس موقع پر ایک اہم سوال سامنے آتا ہے: کسی مجہول راوی کی روایت کو کیونکر صحیح قرار دیا جاسکتا ہے؟ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر جبر بن عبیدہ مجہول ہیں تو ابن حِبانؒ نے ان کی توثیق کیوں کی اور ابن حجرؒ نے ان کو مقبول کیوں ٹھہرایا؟ کہا جاتا ہے کہ ابن حبانؒ کی یہ عادت ہے کہ وہ بغیر ٹھوس شہادت کے تابعین کی توثیق کر دیتے ہیں۔ یہاں ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ ابن حبانؒ کے اس رویے پر علمائے فن کی کیا رائے ہے؟ البانی نے لکھا ہے کہ ''ابن حبانؒ کی عادت ہے کہ ان رُوات کی توثیق کرتے ہیں جو ائمہ اثبات کے ہاں مجہول شمار ہوتے ہیں، جیسا کہ حافظ [ابن حجرؒ] نے لسان المیزان کے مقدمے میں متنبہ کیا ہے''۔(۱۶) پھر علامہ اس پر

استدراک کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ’’بہت سے محققین کے خیال کے برعکس‘ یہ بات علی الاطلاق درست نہیں ہے‘ بلکہ اس میں تفصیل ہے‘‘۔[۱۷] یہ تفصیل علامہ البانی نے اپنی کتاب ’’تمام المنۃ‘‘ میں پیش کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

ابن حبانؒ کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ کی تنبیہہ اور دیگر علماء کے بیان کی وجہ سے یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ ایسا مستور راوی جس کی توثیق ابن حبانؒ کر دیں وہ یا مجہول العین ہوتا ہے یا مجہول الحال۔ ایسا بھی بکثرت ہوتا ہے کہ وہ رُوات جن کی ابن حبانؒ نے توثیق کی ہے وہ بعد میں آنے والے علماء سے بھی توثیق پاتے ہیں۔ لہٰذا متعدد مواقع پر متاخرین نے ابن حبانؒ کے فیصلے کو برقرار رکھا۔ اِن علماء نے ایسے راویوں میں سے بعض کو ’’صدوق‘‘ قرار دیا اور بعض کے بارے میں ’’مَحَلُّہُ الصِدْق‘‘ کی اصطلاح استعمال کی ہے[۱۸]۔ معلوم ہے کہ یہ الفاظ تعدیل کے ہیں‘ جیسا کہ اس فن میں معروف ہے۔ البانی نے دس ایسے راویوں کو بطور مثال پیش کیا ہے جن کی اگلوں میں سے صرف ابن حبانؒ نے توثیق کی تھی۔ بعد میں ابن حجرؒ وغیرہ نے اوپر دیے گئے الفاظ میں اس کی تقریر کر دی۔ اگر ابن حبانؒ کسی ایسے راوی کی توثیق کر دیتے ہیں جو عموماً مجہول سمجھا جاتا ہے اور اس سے ایک یا دو ہی راویوں نے حدیث روایت کی ہوتی ہے‘ تو ایسے لوگوں کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ ضرور تبصرہ کرتے ہیں اور یہ لکھ دیتے ہیں کہ وہ مستور ہے یا مقبول۔ اوپر گزر چکا ہے کہ جبر بن عَبِیدہ کو ابن حجرؒ نے مقبول کہا ہے۔ حافظ سخاویؒ نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے کہ کچھ اہل علم مجہول العدالۃ رُوات کی روایت قبول کرنے میں حق بجانب اس لیے ہیں کہ ’’اخبار [کی قبولیت] راوی کے بارے میں ہمارے حسن ظن پر مبنی ہے۔‘‘[۱۹] سخاویؒ کی یہ بات خاص طور پر اس صورت میں قوی ہے جب ایک مجہول راوی سے بہت سے ثقہ راوی حدیث قبول کر رہے ہوں‘ اور ان کی روایات میں اس راوی کی تنکیر کا کوئی اشارہ نہ ہو۔ سخاویؒ نے کہا ہے: ’’جب معتد بہ ثقہ رواۃ کسی [ضعیف یا مجہول الحال] شخص سے روایت قبول کر رہے ہوں‘ تو اُس راوی کے بارے میں یہ حسن ظن قوی ہو جاتا ہے‘‘۔[۲۰] یہی وجہ ہے کہ علامہ ذہبیؒ‘ حافظ ابن حجرؒ اور دیگر متاخرین نے ان لوگوں کی بھی توثیق کی جنہیں اُن سے قبل ابن حبانؒ کے سوا کسی نے بھی ثقہ قرار نہیں دیا تھا۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ جبر بن عبیدہؒ ایک تابعی ہیں۔ ایک تابعی کا مجہول الحال ہونا اس کی روایت کی صحت کو زیادہ نقصان نہیں پہنچاتا۔ اس کی وجہ

یہ ہے کہ نبی ﷺ نے تابعین کی اجمالاً تعدیل کر دی ہے۔ شمس الائمہ علامہ سرخسیؒ نے صراحت کی ہے کہ پہلے تین قرون کے مجہول رُوات عادل ہیں' کیوں کہ صاحب شریعت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خود ان کی تعدیل کر دی ہے۔ لہٰذا ان قرون کے افراد میں سے کوئی مجہول راوی اس وقت تک عادل ہی شمار ہوگا جب تک اس سے کوئی ایسی بات ظاہر نہ ہو جو اس کی عدالت کو زائل کر دے۔ (۲۱)

خلاصہ یہ ہے کہ جبر بن عبیدۃ کی روایت اس وجہ سے رد نہیں کی جا سکتی کہ کچھ علماء نے انہیں مجہول قرار دیا ہے۔ اس بات کی دلیل یہ ہے کہ اولاً یہ راوی تابعی ہیں اور خیر القرون میں سے ہیں۔ ثانیاً ان پر کوئی جرح نہیں ہے۔ متعدد اہل علم نے ان کی توثیق بھی کی ہے۔ ثالثاً اس مضمون کی روایات کے متعدد طُرق ہیں۔ تعددِ طُرق اور شواہد کی موجودگی میں مجہول راوی کا ضعف دور ہو جاتا ہے۔

طریق دوم: البراء عن الحسن رحمہ اللہ عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ

حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ إِسْحَاقَ' أَخْبَرَنَا الْبَرَاءُ' عَنِ الْحَسَنِ' عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ' قَالَ: حَدَّثَنِي خَلِيلِي الصَّادِقُ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ' أَنَّهُ قَالَ: ''يَكُونُ فِي هَذِهِ الْأُمَّةِ بَعْثٌ إِلَى السِّنْدِ وَالْهِنْدِ' فَإِنْ أَنَا أَدْرَكْتُهُ فَاسْتُشْهِدْتُ فَذَاكَ' وَإِنْ أَنَا فَذَكَرَ كَلِمَةً رَجَعْتُ وَأَنَا أَبُو هُرَيْرَةَ الْمُحَرَّرُ قَدْ أَعْتَقَنِي مِنَ النَّارِ''

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: میرے سچے خلیل' رسول ﷺ نے فرمایا: ''اس اُمّت میں سے سندھ اور ہند کی طرف ایک فوج جائے گی۔'' اگر میں نے اس جنگ کو پا لیا اور [اس میں شریک ہو کر] شہید ہو گیا تو ٹھیک' اور اگر میں —— اس موقع پر راوی کو یاد پڑتا ہے کہ آپ نے کہا واپس لوٹ آیا تو میں ابو ہریرہ مُحَرَّر (مامون) ہوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے آگ سے بچا لیا ہوگا۔ (۲۲)

اس حدیث کی سند میں انقطاع ہے۔ حسن بصریؒ کا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سماع محل نزاع ہے' اور محققین نے براء کو ضعیف لکھا ہے۔ البتہ حمزہ احمد زینؒ نے مسند احمد پر اپنی تعلیق میں اس روایت کو حسن قرار دیا ہے (۲۳)۔ اس کی وجہ واضح ہے کہ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث اس کی معناً شاہد ہے۔ اسی روایت کا پہلا صحیح طریق [جبر بن عبیدہ عن ابی ہریرہؓ] اور کعب الاحبارؒ کی حدیثیں اپنے طُرق کے ساتھ اسے موکد کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے حسن قرار دیا گیا ہے۔ (۲۴)

طریق سوم: کنانہ بن نُبیہ مولی صفیہ رضی اللہ عنہا عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ

حَدَّثَنَا أَبُو الْجَوْزَاءِ أَحْمَدُ بْنُ عُثْمَانَ، وَكَانَ مِنْ نُسَّاكِ أَهْلِ الْبَصْرَةِ، قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الصَّمَدِ قَالَ: حَدَّثَنَا هَاشِمُ بْنُ سَعِيدٍ، عَنْ كِنَانَةَ بْنِ نُبَيْهٍ مَوْلَى صَفِيَّةَ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُولُهُ غَزْوَةَ الْهِنْدِ، فَإِنْ أُدْرِكْهَا أُنْفِقْ فِيهَا نَفْسِي وَمَالِي، فَإِنْ قُتِلْتُ كُنْتُ كَأَفْضَلِ الشُّهَدَاءِ، وَإِنْ رَجَعْتُ فَأَنَا أَبُو هُرَيْرَةَ الْمُحَرَّرُ

’’ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم سے غزوۂ ہند کا وعدہ فرمایا۔ اگر مَیں [یعنی ابو ہریرہؓ] نے اس غزوہ کو پالیا تو میں اس میں اپنا مال اور جان دونوں خرچ کر دوں گا۔ اگر میں اس کے دوران قتل ہو جاتا ہوں تو پھر میں افضل الشہداء کی طرح ہوؤں گا۔ اگر مَیں [سلامتی سے] واپس آ جاتا ہوں تو مَیں ایک ایسا ابو ہریرہ ہوؤں گا جو [آگ سے] مامون ہوگا۔‘‘ (۲۵)

یہ سند بھی ضعیف قرار دی گئی ہے۔ اس میں ایک راوی ہاشم بن سعید کو ائمہ حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے۔ اسی طرح کنانہ بن نُبیہ پر بھی کلام ہے (۲۶)۔ جہاں تک کنانہ بن نُبیہ کا تعلق ہے تو محدثین کے ایک گروہ نے ان کی حدیث قبول کی ہے۔ ابن حبانؒ نے ان کی توثیق کی ہے۔ ابن حجرؒ نے ’’التقریب‘‘ میں انہیں مقبول قرار دیا ہے (۲۷)۔ اسی طرح متابعات میں ہاشم بن سعید بھی مقبول ہیں۔ امام شوکانیؒ نے لکھا ہے کہ حاکمؒ نے ہاشم بن سعید کی ایک دوسری روایت کی تخریج کی ہے، جسے امام سیوطیؒ نے صحیح قرار دیا ہے (۲۸)۔ لہٰذا ہاشم بن سعید کی تجرتح پر محدثین متفق نہیں ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ ہاشم بن سعید کی موجودگی کی وجہ سے ضعف کا حکم صرف اس طریق کی انفرادی حیثیت میں درست قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس مضمون کی دیگر روایات اور کثرتِ طُرق سے جو تقویت اس روایت کے مضمون کو ملتی ہے اس کی بنا پر اسے بھی ہم معتبر کہہ سکتے ہیں۔ اس اصول پر تفصیلی بحث اس فصل کے بعد مضمون کے آخر میں کی جائے گی۔

تیسری حدیث: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت

حَدَّثَنَا بَقِيَّةُ بْنُ الْوَلِيدِ، عَنْ صَفْوَانَ، عَنْ بَعْضِ الْمَشْيَخَةِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم، وَذَكَرَ الْهِنْدَ، فَقَالَ: لَيَغْزُوَنَّ الْهِنْدَ لَكُمْ جَيْشٌ، يَفْتَحُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ حَتّٰى يَأْتُوا بِمُلُوكِهِمْ مُغَلَّلِينَ

بِالسَّلَاسِلِ، يغْفِرُ اللّٰهُ ذُنُوبَهُمْ، فَيَنْصَرِفُونَ حِينَ يَنْصَرِفُونَ فَيَجِدُونَ ابْنَ مَرْيَمَ بِالشَّامِ قَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ: إِنْ أَنَا أَدْرَكْتُ تِلْكَ الْغَزْوَةَ بِعْتُ كُلَّ طَارِفٍ لِي وَتَالِدٍ وَغَزَوْتُهَا، فَإِذَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَانْصَرَفْنَا فَأَنَا أَبُو هُرَيْرَةَ الْمُحَرَّرُ، يَقْدَمُ الشَّامَ فَيَجِدُ فِيهَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ، فَلَأَحْرِصَنَّ أَنْ أَدْنُوَ مِنْهُ فَأُخْبِرُهُ أَنِّي قَدْ صَحِبْتُكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ، قَالَ: فَتَبَسَّمَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ وَضَحِكَ، ثُمَّ قَالَ: ''هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ"

''ابو ہریرہ ؓ روایت کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے ہند کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: تمہارا ایک لشکر ہند سے جنگ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس لشکر کو اُن پر فتح دے گا یہاں تک کہ یہ ہند کے بادشاہوں کو پا بہ سلاسل لائیں گے۔ اللہ تعالیٰ [اس لشکر میں شامل] مجاہدوں کے گناہ معاف فرما دے گا۔ جب وہ واپس لوٹیں گے تو عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو شام میں پائیں گے۔ ابو ہریرہ ؓ نے فرمایا: اگر میں اس غزوے کے وقت موجود ہوا تو میں اس کے لیے اپنی ہر نئی اور پرانی چیز بیچ دوں گا اور اس جنگ میں لڑوں گا۔ اگر اللہ نے ہمیں فتح دی اور ہم واپس لوٹے تو میں ایک آزاد ابو ہریرہؓ ہوؤں گا' جو شام آئے گا اور مسیح ابن مریم علیہ السلام سے ملے گا۔ اے اللہ کے رسولؐ! مَیں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤں اور انہیں بتاؤں کہ مجھے آپ ﷺ کی صحبت حاصل رہی ہے۔ ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اس پر نبی ﷺ مسکرائے۔ اور پھر [تعجب کا اظہار کرتے ہوئے] فرمایا: هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ۔''(۲۹)

یہ روایت بقیہ بن ولید کے ضعف کی وجہ سے کمزور ہے۔ اس کے علاوہ صفوان نے اپنے شیوخ کا نام نہیں لیا' لہٰذا' وہ مجہول ہیں۔ اس لیے تنہا یہ روایت بھی معتبر نہیں ہے۔

چوتھی حدیث: حدیثِ کعب الاحبار رحمہ اللہ

یہ موقوف حدیث ہے' جو کعب الاحبارؒ سے مروی ہے۔ نُعیم ابن عبادؒ نے کتاب الفتن میں اس کی تخریج کی ہے:

حَدَّثَنَا الْحَكَمُ بْنُ نَافِعٍ، عَمَّنْ حَدَّثَهُ عَنْ كَعْبٍ، قَالَ: يَبْعَثُ مَلِكٌ فِي بَيْتِ الْمَقْدِسِ جَيْشًا إِلَى الْهِنْدِ فَيَفْتَحُهَا، فَيَطَئُوا أَرْضَ الْهِنْدِ، وَيَأْخُذُوا كُنُوزَهَا، فَيُصَيِّرُهُ ذَلِكَ الْمَلِكُ حِلْيَةً لِبَيْتِ الْمَقْدِسِ، وَيَقْدَمُ عَلَيْهِ ذَلِكَ الْجَيْشُ بِمُلُوكِ الْهِنْدِ مُغَلَّلِينَ، وَيُفْتَحُ لَهُ مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ، وَيَكُونُ مَقَامُهُمْ

فِی الْھِنْدِ اِلٰی خُرُوجِ الدَّجَّالِ

’’بیت المقدس کا ایک بادشاہ ہند کی طرف ایک لشکر روانہ کرے گا جو ارضِ ہند کو روند دے گا اور اسے فتح کر لے گا۔ یہ لشکر وہاں کے خزانے قبضے میں کر لے گا۔ وہ بادشاہ اس خزانے کو بیت المقدس کی زینت بنائے گا۔ یہ لشکر زنجیروں میں جکڑے ہند کے بادشاہوں کے ساتھ [اپنے بادشاہ] کے پاس پہنچے گا۔ اس بادشاہ کو مشرق اور مغرب پر فتح حاصل ہوگی۔ یہ لشکر خروج دجال تک ہند میں قیام کرے گا۔‘‘(۳۰)

آخری دونوں روایتیں‘ روایت ابوہریرہؓ اور روایتِ کعب الاحبار‘ محدّثین نے ضعیف قرار دی ہیں۔ لیکن جیسا کہ اوپر بیان ہوا‘ جو ضعیف متن کسی صحیح حدیث کے مطابق ہو وہ مقبول ہوتا ہے‘ اور اسی طرح کثرتِ طُرق سے ضعف دور ہو جاتا ہے۔ لہٰذا متابعات میں ضعیف روایت نہ صرف قابلِ قبول ہوتی ہے بلکہ شاہد کی وجہ سے یہ حسن یا صحیح کے درجے میں ترقی کر جاتی ہے۔

علمِ حدیث کا ایک اہم اصول

محدثین کا اصول ہے کہ کثرتِ طرق سے ضعیف حدیث کا ضعف دور ہو جاتا ہے۔(۳۱) اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی روایت کے ایک سے زاید طرق ہوں تو ان اسناد میں رُوات کے ضعف کے باوجود روایت صحت کے درجے تک ترقی کر جاتی ہے۔ اس اصولِ حدیث کی کچھ تفصیل ہے‘ جو یہاں پیش ہے۔

علمائے فنِ حدیث کے مطابق ضعف کی دو اقسام ہیں: پہلی قسم میں راوی کا فسق اور متعلقات آتے ہیں‘ اور دوسری قسم میں راوی کے ضبط کی کمی‘ اختلاط‘ یا اس کا مجہول ہونا شامل ہے۔(۳۲) اکثر محدثین کے مطابق ان میں سے پہلی قسم کا ضعف اگر ہر طریق میں موجود ہو‘ تو کثرتِ طُرق سے بھی اس روایت کا ضعف زائل نہیں ہوگا۔ تاہم کچھ محدثین کے نزدیک اس قسم کا ضعف بھی کثرتِ طُرق سے دور ہو جاتا ہے۔ دوسری قسم کے بارے میں محدّثین کا اتفاق ہے کہ یہ ضعف کثرتِ طُرق سے زائل ہو جاتا ہے۔ اسی بنیاد پر بہت سی ضعیف روایات حسن لغیرہٖ کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔ اسی طرح بہت سی حسن روایات صحیح لغیرہٖ بن جاتی ہیں۔ ابن حجر عسقلانیؒ نے اپنی کتاب ’’التلخیص الحبیر فی تخریج احادیث الرافعی الکبیر‘‘ میں لکھا ہے:

وَالْحَسَنُ لِغَيْرِهٖ: مَا وَرَدَ مِنْ طَرِيقَيْنِ فَأَكْثَرَ' لَا يَخْلُوْ وَاحِدٍ مِنْهَا مِنْ ضُعْفٍ إِلَّا أَنَّهَا بِمَجْمُوْعِهَا تَرَقَّى بِالْحَدِيثِ إِلَى دَرَجَةِ الْحَسَنِ لِغَيْرِهٖ بِشَرْطِ أَنْ يَكُوْنَ الضُّعْفُ غَيْرَ شَدِيْدٍ. أَمَّا الضَّعِيفُ فَهُوَ مَا قَصَرَ عَنْ دَرَجَةِ الْحَسَنِ' وَتَتَفَاوَتُ دَرَجَاتِهٖ ضُعْفاً بِحَسَبِ بُعْدِهٖ مِنْ شُرُوْطِ الصِّحَةِ. وَلَيسَ لِلضَّعِيفِ مَرْتَبَةٌ وَاحِدَةٌ' بَلْ هُوَ قِسْمَانِ. قِسْمٌ يَجْبَرُ بِتَعَدُّدِ الطُّرُقِ' وَقِسْمٌ لَا يَجْبَرُ بِهٰذَا التَّعَدُّدِ' فَالَّذِى يَجْبَرُ بِتَعَدُّدِ الطُّرُقِ يَكُوْنُ نَاشِئاً عَنْ سُوْءِ حِفْظِ رُوَاتِهٖ لَا مِنْ تُهْمَةٍ فِيهِمْ. أَمَّا الضَّعِيفُ الَّذِى لَا يَجْبُرُ ضُعْفَهُ فَهُوَ مَا كَانَ بَعْضُ رُوَاتِهٖ مُتَّهَماً بِالْكِذْبِ أَوِ الْفِسْقِ وَقَدْ يَرْتَقِى بِمَجْمُوْعِهٖ عَنْ كَوْنِهٖ مُنْكَراً أَوْ لَا أَصْلَ لَهُ.

''حسن لغیرہ حدیث دو یا دو سے زیادہ ایسے طُرق سے مروی ہوتی ہے جن میں سے ہر ایک طریق میں کوئی نہ کوئی ضعف ہو۔ البتہ ان سب کا مجموعہ حدیث کو حسن لغیرہ کے درجے میں ترقی دے دیتا ہے۔ اس میں شرط صرف یہ ہے کہ یہ ضعف بہت شدید نہ ہو۔ ضعیف وہ روایت ہوتی ہے جو حسن کے درجے سے قاصر ہو۔ شرائطِ صحت سے بُعد کے لحاظ سے ایسی روایات کے درجات میں فرق واقع ہوتا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ضعیف روایات ایک ہی درجے پر نہیں ہوتیں بلکہ ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جس کا ضعف تعددِ طُرق سے دور ہو جاتا ہے۔ ضعیف کی دوسری قسم وہ ہے جس کا ضعف تعددِ طُرق سے زائل نہیں ہوتا۔ تعددِ طُرق سے دور ہو جانے والا ضعف رُوات کے کردار میں کسی تہمت کی وجہ سے نہیں بلکہ ان حفظ و ضبط کی کمی سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ ضعیف روایت جس کا ضعف اس کے رُوات میں جھوٹ یا فسق کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے وہ کثرتِ طُرق سے دور نہیں ہوتا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ ایسی حدیث کثرت طرق سے کچھ بہتر ہو جائے اور ہم یہ نہ کہہ سکیں کہ یہ منکر ہے یا اس کی کوئی اصل نہیں۔''(۳۳)

علامہ ابن حجرؒ نے یہی بحث اپنی کتاب نزھة النظر فی توضیح نخبة الفکر میں بھی اٹھائی ہے۔ لکھتے ہیں:

وَبِكَثْرَةِ طُرُقِهٖ يُصَحَّحُ' وإِنَّمَا نَحْكُمُ لَهُ بِالصِّحَةِ عِنْدَ تَعَدُّدِ الطُّرُقِ' لِأَنَّ لِلصُّوْرَةِ الْمَجْمُوْعَةِ قُوَّةٌ تَجْبُرُ الْقَدْرَ الَّذِى قَصَرَ بِهٖ ضَبْطُ رَاوِى الْحَسَنِ عَنْ رَاوِى الصَّحِيحِ' وَمِنْ ثَمَّ تُطْلَقُ الصِّحَةُ عَلَى الْإِسْنَادِ الَّذِى يَكُوْنُ

حَسَناً لِذَاتِهِ - لَوْ تَفَرَّدَ - إِذَا تَعَدَّدَ.

’’[حسن حدیث] کثرتِ طُرق کی وجہ سے صحیح قرار پاتی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مجموعے میں اتنی قوت ہے کہ حسن روایت کے راوی کے ضبط کی وہ کمی‘ جس نے اسے صحیح کے درجہ سے گرا دیا تھا‘ دور ہو جائے گی۔ اسی وجہ سے حسن لذاتہٖ سند کو اس کے تعددِ طُرق کی وجہ سے صحیح قرار دیا جاتا ہے‘اگرچہ وہ متفرد ہو۔‘‘(۳۴)

اسی طرح ابوعبداللہ شمس الدین محمد معروف بابن امیر حاج حنفیؒ نے التقریر و التحبیر علی تحریر الکمال بن الھمام میں لکھا ہے:

(حَدِيثُ الرَّاوِي الضَّعِيفِ لِلْفِسْقِ لَا يَرْتَقِي بِتَعَدُّدِ الطُّرُقِ إِلَى الْحُجِّيةِ) لِعَدَمِ تَأْثِيرِ مُوَافَقَةِ غَيْرِهِ فِيهِ كَمَا ذَكَرَهُ النَّوَوِي (وَلِغَيْرِهِ) أَي وَحَدِيثُ الضَّعِيفِ لِغَيْرِ الْفِسْقِ كَسُوءِ الْحِفْظِ مَعَ الصِّدْقِ وَالدِّيَانَةِ يَرْتَقِي بِتَعَدُّدِ الطُّرُقِ إِلَى الْحُجِّيةِ

’’(فسق کی وجہ سے ضعیف راوی کی حدیث تعددِ طُرق کے باوجود حجت نہیں بنتی کیونکہ) اس کے معاملے میں کسی دوسرے [راوی] کی موافقت کوئی اثر نہیں ڈالتی‘ جیسا کہ نوویؒ نے بیان کیا ہے۔ [وہ ضعیف حدیث جس کے ضعف کی وجہ] (اس کے سوا ہے)‘یعنی اس کی وجہ راوی کا فسق نہیں ہے بلکہ اس کے حفظ اور ضبط کی کمزوری ہے جبکہ وہ صداقت اور دیانت سے متصف ہو‘تو [ایسی حدیث] تعددِ طُرق کی وجہ سے حُجّت بن جائے گی۔‘‘(۳۵)

اس کے بعد وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ایک راوی کے مجہول ہونے کے سبب جو ضعف حدیث کو لاحق ہوتا ہے وہ کس طرح زائل ہوتا ہے:

(وَأَمَّا) الطَّعْنُ فِي الْحَدِيثِ (بِالْجَهَالَةِ) لِرَاوِيهِ بِأَنْ لَمْ يعْرَفْ فِي رِوَايَةِ الْحَدِيثِ إِلَّا بِحَدِيثٍ أَوْ بِحَدِيثَيْنِ (فَبِعَمَلِ السَّلَفِ) بِهِ يَزُولُ الطَّعْنُ فِيهِ لِأَنَّ عَمَلَهُمْ بِهِ إِمَّا لِعِلْمِهِمْ بِعَدَالَةِ الرَّاوِي وَحُسْنِ ضَبْطِهِ أَوْ لِمُوَافَقَتِهِ سَمَاعَهُمْ ذٰلِكَ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ أَوْ مِنْ سَامِعٍ مِنْهُ ذٰلِكَ مَشْهُورٌ لِانْتِفَاءِ اتِّهَامِهِمْ بِالتَّقْصِيرِ فِي أَمْرِ الدِّينِ مَعَ مَا لَهُمْ مِنَ الرُّتْبَةِ الْعَالِيَةِ فِي الْوَرَعِ وَالتَّقْوَى (وَسُكُوتُهُمْ) أَي السَّلَفِ (عِنْدَ اشْتِهَارِ رِوَايَتِهِ) أَي الْحَدِيثِ الَّذِي رَاوِيهِ بِالصِّفَةِ الْمَذْكُورَةِ (كَعَمَلِهِمْ) بِهِ (إِذْ لَا يسْكُتُونَ

عَنْ مُنْكَرٍ) يَسْتَطِيعُونَ إِنْكَارَهُ

’’جب ایک حدیث پر طعن کی وجہ یہ ہو کہ اس کا راوی مجہول ہو بایں طور کہ وہ روایتِ حدیث کے حوالے سے معروف نہ ہو بلکہ اس نے صرف ایک یا دو روایتیں ہی بیان کی ہوں‘ تو اس نوع کا طعن سلف صالحین کے عمل سے رفع ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سلف صالحین ایسی حدیث پر صرف اس صورت میں عمل کرتے ہیں کہ جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ یا راوی عادل اور ضابط ہے‘ یا اس راوی کی روایت کے مضمون کی موافقت میں ان کے پاس رسول اللہ ﷺ سے مسموع کوئی دلیل موجود ہوتی ہے‘ جو انہوں نے حضور کریم ﷺ سے خود سنی ہو‘ یا کسی مشہور راوی کے واسطے سے ان کے علم میں آئی ہو۔ یہ بات اس وجہ سے درست ہے کہ اسلاف پر دین کے معاملے میں کوئی تہمت نہیں ہے‘ نیز سلف صالحین تقویٰ اور پرہیزگاری کے بہت اعلیٰ مقام پر تھے۔ ان لوگوں کا کسی ایسے مجہول راوی کی روایت کے معروف ہو جانے کے باوجود اس کے بارے میں خاموش رہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس راوی کو جانتے ہیں۔ اسلاف کسی منکر پر انکار کی قدرت کے باوجود خاموش نہیں رہتے تھے۔‘‘(۳۶)

درج بالا تفصیلات سے یہ واضح ہوتا ہے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور کعب احبارؒ کی یہ روایتیں‘ اپنے بنیادی نکتے میں یعنی غزوۂ ہند میں ایک جنگ ہو گی جس میں شرکت مسلمانوں کے لیے باعث ثواب ہو گی‘ صحیح روایات کے مطابق ہیں‘ لہٰذا مستند ہیں۔

حاصلِ بحث

دورِ حاضر میں متعدد متجدّدین نے غزوۂ ہند کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کی پیش گوئی کا انکار کیا ہے۔ یہ اخبار متعدد طُرق سے اور ایک سے زائد صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے مروی ہیں۔ ان میں سے ایک روایت صحیح کی شرائط پر پوری اترتی ہے۔ دیگر کا ضعف بھی تعددِ طُرق اور متابعات و شواہد کی وجہ سے زائل ہو گیا ہے‘ کیوں کہ کتبِ اصولِ حدیث سے رہنمائی ملتی ہے کہ تعددِ طرق جابرِ ضعف ہوتا ہے۔ اس اصول کی روشنی میں ان اخبار کا انتساب نبی اکرم ﷺ کی جانب درست ہے۔ روایات کے مجموعے کو کسی ایک روایت کے مخصوص راوی پر طعن کی وجہ سے مطلقاً مسترد کرنا علم اصولِ حدیث اور فنِ رجال سے ناواقفیت کے بغیر ممکن نہیں۔ غزوۂ ہند پر متجددین کے رشحاتِ قلم دراصل اسی ناواقفیت کا نمونہ ہیں۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اصولِ حدیث سے عدمِ اعتناء دراصل متجدّدین کے سیاسی موقف سے پھوٹتا ہے۔ پس استعمار' بالخصوص نائن الیون کے بعد جہاد وقتال سے متعلق دینی احکامات مغرب کے شدید حملے کی زد میں ہیں۔ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ کسی لومۃ لائم کی پروا کیے بغیر' دینی احکامات کو نہ صرف بے کم وکاست بیان کریں بلکہ ان پر قائم رہنے کی جرأت بھی پیدا کریں۔ اس کے برعکس متجددین اپنی دوسو سالہ روایات کے عین مطابق ہر اس دینی حکم کی تاویل اور انکار ضروری سمجھتے ہیں جو جدیدیت کے تقاضوں کے مطابق نہ ہو۔ چنانچہ متجددین کے لیے ایسے تمام دینی احکام واخبار کا انکار کرنا لازم ہے جن سے جنگ وقتال یا مزاحمت کی بُو آتی ہو۔ اس پر مستزاد' امریکا کی اس خطے کے حوالے سے موجودہ پالیسی ہے کہ برصغیر کے مسلمان بھارت کی بالادستی قبول کرلیں۔ چنانچہ متجددین کا یہ فرضِ اوّلیں ٹھہرا ہے کہ دین کی ایسی تشریح کریں جو مغرب کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی ابھرتی ہوئی سیاسی قوت' جو ہندوتوا کے لباس میں ظاہر ہورہی ہے' کے لیے بھی قابلِ قبول ہو' لہٰذا ہمارے متجدّدین ہندوستان پر یلغار کرنے کے استحباب کو کیسے قبول کرسکتے ہیں۔ بظاہر غزوۂ ہند کی روایات کے انکار کے پیچھے یہ جذبہ بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ یہ دین کی سیاسی تعبیر کی بدترین مثال ہے۔

❁❁❁

حواشی

(۱) علی بن محمد' ابوحسن نورالدین ملاہروی قاری' الاسرار المرفوعة فی الاخبار الموضوعة (بیروت: مؤسسۃ: ۱۴۳۱ء)' صفحات: ۴۳۸اور ۴۷۲ تا ۴۷۳

(۲) ابواحمد بن عدی جرجانی' الکامل فی ضعفاء الرجال (بیروت: الکتب العلمیہ' ۱۹۹۷ء)' جلد:۱' صفحہ:۲۱۲

(۳) ابوبکر احمد بن علی خطیب بغدادی' الجامع لاخلاق الراوی و آداب السامع (ریاض: مکتبہ المعارف' ۱۴۳۱ھ)' جلد:۲' صفحہ:۱۶۲

(۴) غزوۂ ہند کے بارے میں نبی ﷺ سے مروی روایات کا انکار جدیدیت زدہ طبقے کا معروف موقف ہے۔ موجودہ دور میں جاوید احمد غامدی اور ان کے تلامذہ بھی اس موقف کے عَلم بردار ہیں۔ مثلاً عمار خان ناصر کہتے ہیں کہ اگرچہ اس موضوع پر ایک حدیث صحیح ہے' مگر یہ پیش گوئی صادق آچکی ہے۔ دیگر روایات ضعیف ہیں۔ دیکھیے: عمار خان ناصر' ''لبرل ازم اور جمہوریت

کی ناکامی کی بحث'''' ماہنامہ الشریعۃ ۳۰' نمبر ۱۰' (۲۰۱۹ء): صفحہ ۳۔ المورد کے اردو جریدے اشراق میں غامدی صاحب کے تلمیذ معز امجد نے ایسی تمام روایات کی اسانید کو ضعیف ثابت کرنے کی کوشش ہے اور اشارہ کیا ہے کہ ان روایات کو نبی ﷺ کی طرف منسوب کرنا گویا اپنے ''جذبات اور احساسات کی تسکین کے لیے''، ''خدا کی شریعت سے آنکھیں بند کرنا، ''اس کی پسند اور ناپسند کو پس پشت'' ڈالنا، اور ''پیغمبرؐ کی طرف غلط باتیں منسوب'' کرنا ہے۔ دیکھیے: معز امجد ''غزوۂ ہند''' ماہنامہ اشراق ۱۱' نمبر ۲' (۱۹۹۹ء): صفحات: ۵۰ تا ۵۸۔ خورشید احمد ندیم نے حسبِ معمول اس علمی مسئلے کو صحافیانہ سطح پر گرادیا ہے۔ دیکھیے: خورشید احمد ندیم، ''جنگ' مذہب اور پاکستان''، روزنامہ دنیا' ۱۱ اکتوبر' ۲۰۱۶ء۔

یہ تینوں حضرات دراصل غامدی صاحب ہی کے موقف پر انحصار کر رہے ہیں' جسے انہوں نے متعدد مواقع پر بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ''اس طرح کی کوئی روایت صحت کے ساتھ ثابت نہیں ہے''۔ ان روایات کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر اس روایت میں کوئی سچائی ہے' تو یہ واقعہ بنواُمیہ کے دور میں گزر چکا' یعنی بہرصورت اس روایت کو مسلمانوں کے علم و عمل میں جگہ نہیں ملنی چاہیے۔ دیکھیے:

https://www.youtube.com/watch?v=uheUj3EEDXQ

(۵) ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب خراسانی نسائی' سنن نسائی (قاہرہ: مکتبہ تجاریہ کبریٰ ۱۹۸۶ء)' جلد: ۶' صفحہ: ۴۲۔ نسائیؒ کے علاوہ اس حدیث کی تخریج امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں' امام بخاریؒ نے التاریخ الکبیر میں' ابوعروبہ حرانیؒ نے ایک جزو میں' ابن عدیؒ نے الکامل فی ضعفاء الرجال میں' ابن ابی عاصمؒ نے الجہاد میں' طبرانیؒ نے المعجم الاوسط اور مسند الشامیین میں' بیہقیؒ نے سنن الکبریٰ میں' اور ابن عساکرؒ نے تاریخ دمشق میں کی ہے۔ دیکھیے: ابوعبداللہ احمد بن محمد بن حنبل شیبانی' مسند' تحقیق شعیب ارنؤوط (بیروت: مؤسسہ رسالہ' ۲۰۰۱ء)' جلد: ۳۷' صفحہ: ۸۱؛ ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بخاری' التاریخ الکبیر (حیدر آباد' دکن: دائرہ معارف عثمانیہ' تاریخ ندارد)' جلد: ۶' صفحات: ۷۲ تا ۷۳؛ ابوعروبہ حسین بن محمد حرانی' جزء ابی عروبہ (ریاض: مکتبہ الرشد' ۱۹۹۸ء)' صفحہ: ۵۸؛ ابواحمد بن عدی جرجانی' الکامل فی ضعفاء الرجال' جلد: ۱' صفحہ: ۲۱۲؛ ابن ابی عاصم، الجہاد (دمشق: دار القلم، ۱۹۸۹ء)، جلد: ۲، صفحہ: ۶۵؛ ابو القاسم سلیمان بن احمد طبرانی، المعجم الاوسط (قاہرہ: دارالحرمین، ۱۹۹۵ء)، جلد: ۷، صفحہ: ۲۳؛ ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی، مسند الشامیین (بیروت: مؤسسہ الرسالہ، ۱۹۸۴ء)، جلد: ۳، صفحہ: ۸۹؛

ابوبکراحمد بن حسین بن علی بن بیہقی، السنن الکبریٰ (قاہرہ: مرکز ہجر للبحوث والدراسات العربیہ والاسلامیہ، ۲۰۱۱ء)، جلد: ۱۸، صفحات: ۵۸۱ تا ۵۸۳؛ ابو قاسم علی بن حسن شافعی ابن عساکر، تاریخ دمشق (دمشق: دار الفکر للطباعہ والنشر والتوزیع، ۱۹۹۵ء)، جلد: ۵۲، صفحہ: ۲۴۸۔

(۶) تلقین قبول کرنے سے مراد یہ ہے کہ اگر انہیں پرکھنے کی غرض سے کہا جاتا کہ آپ نے فلاں روایت کی ہے، تو قلتِ ضبط کی وجہ سے وہ یہ بات مان لیتے تھے، اگرچہ وہ روایت انہوں نے بیان نہیں کی ہوتی تھی۔ یہ راوی کے ضعف کی ایک شکل ہے۔

(۷) ابوعبدالرحمٰن محمد ناصر الدین البانی، سلسلة الاحادیث الصحیحة (ریاض: مکتبہ المعارف للنشر والتوزیع، ۱۹۹۵ء)، جلد: ۴، صفحہ: ۵۷۰

(۸) نسائی، سنن نسائی، جلد: ۶، صفحہ: ۴۲۔ حدیث کا یہ متن سنن نسائیؒ سے لیا گیا ہے۔ یہ حدیث الفاظ کی تھوڑی تبدیلی کے ساتھ کئی کتبِ حدیث میں روایت کی گئی ہے: امام احمد بن حنبلؒ کی مسند، حاکمؒ کی المستدرک علی الصحیحین، نسائیؒ کی سنن، بیہقیؒ کی السنن الکبریٰ، نعیم ابن حمادؒ کی الفتن، بزارؒ کی البحر الزخار، خطیب بغدادیؒ کی تاریخ بغداد اور ابونعیم احمد بن عبداللہؒ کی حلیہ الاولیاء و طبقات الاصفیاء۔ دیکھیے: احمد بن حنبل، مسند، تحقیق شعیب ارنؤوط، جلد: ۱۲، صفحات: ۲۸ تا ۲۹؛ ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم نیساپوری، المستدرک علی الصحیحین (بیروت: دارالکتب العلمیہ، ۱۹۹۰ء)، جلد: ۳، صفحہ: ۵۸۸؛ ابوبکر احمد بن حسین بن علی بن بیہقی، السنن الکبریٰ، جلد: ۱۸، صفحات: ۵۸۱؛ ابوعبداللہ تعالیٰ نعیم بن حماد، کتاب الفتن (قاہرہ: مکتبہ التوحید، ۱۴۱۲ھ)، جلد: ۱، صفحہ: ۴۰۹؛ ابوبکر احمد بن عمرو بن عبدالخالق المعروف بالبزار، البحر الزخار (مدینہ منورہ: مکتبہ العلوم والحکم، ۲۰۰۹ء)، جلد: ۱۵، صفحہ: ۳۰۲؛ ابوبکر احمد بن علی بن ثابت بن احمد خطیب البغدادی، تاریخ بغداد (بیروت: دارالغرب الاسلامی، ۲۰۰۲ء)، جلد: ۱۱، صفحہ: ۳۷۷؛ ابونعیم احمد بن عبداللہ اصبہانی، حلیہ الاولیاء و طبقات الاصفیاء (مصر: مطبعۃ السعادہ، ۱۹۷۴ء)، جلد: ۸، صفحہ: ۳۱۶۔ ان مراجع میں حدیث کے متن میں معمولی اختلافات موجود ہیں۔ لہٰذا مسند احمد، مستدرک حاکم، اور حلیة الاولیاء میں درج ذیل الفاظ یا ان کا متبادل موجود نہیں ہے: فَإِنْ أَدْرَكْتُهَا أُنْفِقُ فِيهَا نَفْسِي وَمَالِي۔ تاریخ الکبیر اور فتن نعیم بن حماد میں فعل ''اَنفقتُ'' آیا ہے۔ باقی تمام مصادر میں ''أُنفِقُ'' ہے۔ تاریخ بغداد میں ''اِنْ اَنَا اَدْرَكْتُهَا'' میں لفظ ''اَنَا'' کا اضافہ ہے۔ اور اسی طرح تاریخ بغداد میں ''أُنفِقُ/اَنفقتُ فِيهَا نَفْسِيْ وَ مَالِي'' کی بجائے

’’اَتْبَعْتُ فِیْهَا نَفْسِی‘‘ ہے۔اوپر دیے گئے متن کے علاوہ تاریخ الکبیر اور مسندِ بزاز کی روایت میں فعل’’فَإِنْ قُتِلْتَ‘‘ ہے۔ نسائی کی سُنن میں’’اُقْتَل‘‘ ہے جبکہ باقی تمام مصادر میں’’اسْتُشْهِدْتُ‘‘ کا فعل آیا ہے۔ مسند احمد‘ مستدرک حاکم اور حلیۃ الاولیاء میں’’کُنْتُ مِنْ خَیرِ الشُّهَدَاءِ‘‘ ہے‘باقی تمام مصادر میں اس کی جگہ’’أَفْضَلَ الشُّهَدَاءِ‘‘کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ تاریخ کبیر اور بزاز میں’’کُنْتُ‘‘ کی بجائے’’فَأَنَا مِنْ‘‘ آیا ہے۔ نسائیؒ کے سوا تمام مصادر میں’’اِنْ رَجِعْتُ‘‘ ہے۔ نسائیؒ کی روایت میں پہلے حصے کی مطابقت میں فعل’’اَرْجِعْ‘‘ استعمال ہوا ہے۔

(۹) احمد بن حنبل‘ مسند‘ تحقیق احمد شاکر (قاہرہ: دار الحدیث‘ ۲۰۰۱ء)‘ جلد: ۶‘ صفحات: ۵۳۲ تا ۵۳۳

(۱۰) احمد بن حنبل‘ مسند‘ تحقیق شعیب ارنؤوط‘ جلد: ۱۲‘ صفحہ: ۲۹

(۱۱) احمد بن حنبل‘ مسند‘ تحقیق شعیب ارنؤوط‘ جلد: ۱۲‘ صفحہ: ۲۹

(۱۲) احمد بن حنبل‘ مسند‘ تحقیق احمد شاکر‘ جلد: ۶‘ صفحات: ۵۳۲ تا ۵۳۳

(۱۳) احمد بن علی بن محمد بن احمد بن حجر عسقلانی‘ تقریب التھذیب (شام: دار الرشید‘ ۱۴۰۶ھ)‘ صفحہ: ۱۳۷

(۱۴) احمد بن عبد الرحمان بن محمد البنا ساعاتی‘ الفتح الربانی لترتیب مسند الامام احمد بن حنبل شیبانی (داراحیاء التراث العربی‘ تاریخ ندارد)‘ جلد: ۱۴‘ صفحہ: ۲۸

(۱۵) ابوعبد الرحمٰن محمد ناصر الدین البانی‘ ضعیف سنن النسائی (ریاض: مکتبہ المعارف للنشر والتوزیع‘ ۱۹۹۸ء)‘ صفحہ: ۹۴

(۱۶) ابوعبد الرحمان محمد ناصر الدین البانی‘ تخریج احادیث فضائل الشام (ریاض: مکتبۃ المعارف للنشر والتوزیع‘ ۲۰۰۰ء)‘ صفحہ: ۱۹

(۱۷) البانی‘ تخریج احادیث فضائل الشام‘ صفحات: ۱۹ تا ۲۰

(۱۸) البانی‘ تمام المنہ فی التعلیق علی فقه السنه (ریاض: دار الرایۃ للنشر والتوزیع‘ تاریخ ندارد)‘ صفحہ: ۲۰۵

(۱۹) البانی‘ تمام المنہ فی التعلیق علی فقه السنه‘ صفحہ: ۲۰۶

(۲۰) البانی‘ تمام المنہ فی التعلیق علی فقه السنه‘ صفحہ: ۲۰۷

(۲۱) ابوبکر محمد بن احمد بن ابی سہل سرخسی‘ اصول السرخسی (حیدرآباد‘ انڈیا: لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ‘ ۱۳۹۵ھ)‘ جلد: ۱‘ صفحہ: ۳۵۲

(۲۲) احمد بن حنبل‘ مسند‘ تحقیق شعیب ارناؤوط‘ جلد: ۱۴‘ صفحہ: ۴۱۹

(۲۳) دیکھیے تعلیق: احمد بن حنبل، مسند، تحقیق شعیب ارناؤوط، جلد: ۱۴، صفحہ: ۴۱۹

(۲۴) ابو احمد محمد عبد اللہ اعظمی، الجامع الکامل فی الحدیث الصحیح الشامل المرتب علی ابواب الفقہ (ریاض: دار الاسلام للنشر والتوزیع ۲۰۱۶ء)، جلد: ۸، صفحہ: ۴۴۸

(۲۵) ابن ابی عاصم، الجہاد (دمشق: دار القلم، ۱۹۸۹ء)، جلد: ۲، صفحہ: ۶۶۸

(۲۶) احمد بن حنبل، مسند، تحقیق شعیب ارناؤوط، جلد: ۱۲، صفحہ: ۲۹

(۲۷) اعظمی، الجامع الکامل فی الحدیث الصحیح الشامل المرتب علی ابواب الفقہ، جلد: ۷، صفحہ: ۲۱۴

(۲۸) شہاب الدین ابو عباس احمد بن احمد بن محمد بن عیسیٰ فاسی، عدۃ المرید الصادق (دار ابن حزم، ۲۰۰۶ء)، صفحہ: ۲۵۲

(۲۹) نعیم بن حماد، کتاب الفتن، جلد: ۱، صفحہ: ۴۰۹ اور ۴۱۰؛ ابو یعقوب اسحاق بن ابراہیم ابن راہویہ، مسند اسحاق بن راہویہ (مدینہ منورہ: مکتبہ الایمان، ۱۹۹۱ء)، جلد: ۱، صفحہ: ۴۶۲

(۳۰) نعیم بن حماد، کتاب الفتن، جلد: ۱، صفحہ: ۴۰۲ اور ۴۰۹

(۳۱) ابو فضل احمد بن علی بن محمد بن احمد بن حجر عسقلانی، نزھۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر فی مصطلح اھل العصر (۲۰۲۱ء)، صفحہ: ۸۹

(۳۲) ابو فضل احمد بن علی بن محمد بن احمد بن حجر عسقلانی، التلخیص الحبیر (بیروت: دار الکتب العلمیہ، ۱۹۸۹ء)، جلد: ۱، صفحہ: ۸۹

(۳۳) عسقلانی، التلخیص الحبیر (بیروت: دار الکتب العلمیہ، ۱۹۸۹ء)، جلد: ۱، صفحہ: ۸۹

(۳۴) عسقلانی، نزھۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر فی مصطلح اھل العصر، صفحہ: ۸۹

(۳۵) ابو عبد اللہ شمس الدین محمد بن محمد ابن امیر حاج، التقریر والتحبیر علی تحریر الکمال بن الھمام (بیروت: دار الکتب العلمیہ، ۱۹۸۳ء)، جلد: ۲، صفحہ: ۲۴۹

(۳۶) ابن امیر حاج، التقریر والتحبیر علی تحریر الکمال بن الھمام، جلد: ۲، صفحہ: ۲۴۹

کتابیات

☆ ابن ابی عاصم، احمد بن عمرو شیبانی، الجہاد، دمشق: دار القلم، ۱۹۸۹ء

☆ ابن امیر حاج، ابو عبد اللہ شمس الدین محمد بن محمد، التقریر والتحبیر علی تحریر الکمال بن الھمام، بیروت: دار الکتب العلمیہ، ۱۹۸۳ء

☆ ابن راہویہ، ابو یعقوب اسحاق بن ابراہیم، مسند اسحاق بن راہویہ، مدینہ منورہ: مکتبہ الایمان، ۱۹۹۱ء

☆ ابن عساکر، ابو قاسم علی بن حسن الشافعی، تاریخ دمشق، دمشق: دار الفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع، ۱۹۹۵ء

☆ ابن ماجہ' ابوعبداللہ محمد بن یزید القزوینی' سنن ابن ماجه' مصر: داراحیاء الکتب العربیہ' تاریخ ندارد
☆ ابن ملقن' سراج الدین ابوحفص عمر بن علی بن احمد الشافعی' مختصر تلخیص الذہبی' ریاض: دار العاصمہ' ۱۴۱۱ھ
☆ اصبہانی' ابونعیم احمد بن عبداللہ' حلیه الاولیاء و طبقات الاصفیاء' مصر: مطبعه السعاده' ۱۹۷۴ء
☆ اعظمی' ابواحمد محمد عبداللہ' الجامع الكامل فی الحدیث الصحیح الشامل المرتب علی ابواب الفقه' ریاض: دارالاسلام للنشر والتوزیع' ۲۰۱۶
☆ البانی' ابوعبدالرحمان محمد ناصر الدین' تمام المنه فی التعلیق علی فقه السنه' ریاض: دارالراية للنشر والتوزيع' تاریخ ندارد
☆ سلسلة الاحاديث الصحيحة و شیء من فقهها و فوائدها' ریاض: مکتبہ المعارف للنشر والتوزیع' ۱۹۹۵ء
☆ ضعیف سنن النسائی' ریاض: مکتبہ المعارف للنشر والتوزیع' ۱۹۹۸ء
☆ تخریج احادیث فضائل الشام' ریاض: مکتبہ المعارف للنشر والتوزیع' ۲۰۰۰ء
☆ بخاری' ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم' التاریخ الکبیر' حیدرآباد دکن: دائرہ معارف عثمانیہ' تاریخ ندارد
☆ بزاز' ابوبکر احمد بن عمرو بن عبدالخالق' البحر الزخار' مدینہ منورہ: مکتبہ العلوم والحکم' ۲۰۰۹ء
☆ بغدادی' ابوبکر احمد بن علی خطیب' الجامع لاخلاق الراوی و آداب السامع' ریاض: مکتبہ المعارف' ۱۴۳۱ھ
☆ بغدادی' ابوبکر احمد بن علی بن ثابت بن احمد خطیب' تاریخ بغداد' بیروت: دار الغرب الاسلامی' ۲۰۰۲ء
☆ بیہقی' ابوبکر احمد بن حسین بن علی' السنن الکبریٰ' قاہرہ: مرکز هجر للبحوث والدراسات العربيه والاسلاميه' ۲۰۱۱ء
☆ جرجانی' ابواحمد بن عدی' الكامل فی ضعفاء الرجال' بیروت: الکتب العلمیہ' ۱۹۹۷ء
☆ حرانی' ابوعروبہ حسین بن محمد' جزء ابی عروبه' ریاض: مکتبہ الرشد' ۱۹۹۸ء
☆ ساعاتی' احمد بن عبدالرحمان بن محمد البنا' الفتح الربانی لترتيب مسند الإمام احمد بن حنبل الشيبانی' داراحیاء التراث العربی' تاریخ ندارد

☆ سرخسی، ابوبکر محمد بن احمد بن ابی سہل، اصول السرخسی، حیدرآباد انڈیا: لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ، ۱۳۹۵ھ
☆ شیبانی، ابوعبداللہ احمد بن محمد بن حنبل، مسند، تحقیق احمد شاکر، قاہرہ: دارالحدیث، ۲۰۰۱ء
☆ شیبانی، ابوعبداللہ احمد بن محمد بن حنبل، مسند، تحقیق شعیب ارنؤوط، بیروت: مؤسسہ رسالہ، ۲۰۰۱ء
☆ طبرانی، ابوالقاسم سلیمان بن احمد، مسند الشامیین، بیروت: مؤسسہ الرسالہ، ۱۹۸۴ء
☆ طبرانی، ابوالقاسم سلیمان بن احمد بن ایوب، المعجم الکبیر، قاہرہ: مکتبہ ابن تیمیہ، ۱۹۹۴ء
☆ طبرانی، ابوالقاسم سلیمان بن احمد، المعجم الاوسط، قاہرہ: دارالحرمین، ۱۹۹۵ء
☆ عسقلانی، ابوالفضل احمد بن علی بن محمد بن احمد بن حجر، التلخیص الحبیر، بیروت: دارالکتب العلمیہ، ۱۹۸۹ء
☆ عسقلانی، ابوالفضل احمد بن علی بن محمد بن احمد بن حجر، المطالب العالیۃ بزوائد المسانید الثمانیۃ، ریاض: دارالعاصمہ للنشر والتوزیع، ۲۰۰۰ء
☆ عسقلانی، ابوالفضل احمد بن علی بن محمد بن احمد بن حجر، نزھۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر فی مصطلح اھل العصر، دمشق: مکتبہ الصباح، ۲۰۰۰ء
☆ عسقلانی، احمد بن علی بن محمد بن احمد بن حجر، تقریب التھذیب، شام: دارالرشید، ۱۴۰۶ھ
☆ فاسی، شہاب الدین ابوالعباس احمد بن احمد بن محمد بن عیسیٰ، عدۃ المرید الصادق، دارابن حزم، ۲۰۰۶ء
☆ قاری، علی بن محمد، ابوحسن نورالدین مُلا، الاسرار المرفوعۃ فی الاخبار الموضوعۃ، بیروت: مؤسسۃ: ۱۴۳۱ء
☆ معز امجد، غزوۂ ہند، ماہنامہ اشراق ۱۱، نمبر ۲، (۱۹۹۹ء): صفحات: ۵۰ تا ۵۸
☆ ناصر، عمار خان، ''لبرل ازم اور جمہوریت کی ناکامی کی بحث'' ماہنامہ الشریعہ ۳۰، نمبر ۱۰، (۲۰۱۹ء): صفحات: ۲ تا ۶
☆ ندیم، خورشید احمد، ''جنگ، مذہب اور پاکستان''، روزنامہ دنیا، ۱ اکتوبر ۲۰۱۶ء
☆ نسائی، ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب خراسانی، سنن نسائی، قاہرہ: مکتبہ تجاریہ کبریٰ، ۱۹۸۶ء
☆ نعیم بن حماد، ابوعبداللہ، کتاب الفتن، قاہرہ: مکتبہ التوحید، ۱۴۱۲ھ
☆ نیسابوری، ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم، المستدرک علی الصحیحین، بیروت: دارالکتب العلمیہ، ۱۹۹۰ء

(تشکّر: سہ ماہی حرفِ نیم گفتہ لاہور)

❁❁❁

داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی چند فکر انگیز تالیفات

قرآن حکیم کی عظمت و تعارف اور حقوق و مطالبات
جیسے علمی و عملی موضوعات پر 8 کتابوں کا مجموعہ

قرآنِ حکیم اور ہم

اشاعت خاص 1500 روپے

عظمت مصطفیٰ ﷺ، مقصد بعثت، اسوۂ رسول ﷺ اور
سیرت نبویؐ کے انقلابی پہلوؤں پر مشتمل مقالات کا مجموعہ

رسولِ اکرم ﷺ اور ہم

اشاعت خاص 1500 روپے، اشاعت عام 800 روپے

سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں اسلامی انقلاب
کے مراحل و مدارج اور لوازم

منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ

مجلد 500 روپے، غیر مجلد 300 روپے

سیرت مطہرہ کے دل پذیر موضوع پر ڈاکٹر صاحب
کی زندگی کے آخری خطابات کا مجموعہ

سیرتِ خیرُ الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام

صفحات 240، قیمت 550 روپے

اخلاص فی العبادت اور اقامتِ دین
کی اہمیت و فرضیت، بعنوان:

توحیدِ عملی

سورۃ الزمر تا سورۃ الشوریٰ کی روشنی میں

اشاعت خاص 225 روپے، اشاعت عام 150 روپے

شرک کی حقیقت، اقسام اور دورِ حاضر
کے شرک سے واقفیت کے لیے مطالعہ کیجیے

حقیقت و اَقسامِ شرک

اشاعت خاص 400 روپے، اشاعت عام 150 روپے

امت مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں قرآن کی جامع ترین سورت

سُورۃُ الحَدید

(اُمُّ المُسَبِّحات) کی مختصر تشریح

اشاعت خاص 500 روپے، اشاعت عام 300 روپے

خلافت کی حقیقت، تاریخی پس منظر، عہد حاضر میں
اس کا ڈھانچہ اور اس کے قیام کے نبوی طریق پر مشتمل

خلافت کی حقیقت

اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام

اشاعت خاص 300 روپے، اشاعت عام 180 روپے

مکتبہ خدام القرآن

36-K ماڈل ٹاؤن لاہور
فون 3-35869501 (042)
ای میل maktaba@tanzeem.org ویب سائٹ www.tanzeem.org

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

اب دو انداز سے دستیاب ہے

خوبصورت ٹائٹل • سفید کاغذ • معیاری طباعت

1. 2935 صفحات پر مشتمل، سات جلدوں میں
(الگ الگ جلدیں بھی دستیاب ہیں!)
مکمل سیٹ کی قیمت: 6000 روپے

2. متعدد اضافی خوبیوں کا حامل، طبع جدید
قرآنی رسم الخط • تفسیری سائز • عمدہ سفید کاغذ • مضبوط مراکو جلد
2560 صفحات پر مشتمل، چار جلدوں میں
مکمل سیٹ کی قیمت: 9600 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

Feb. 2024
Vol.73

Regd. CPL No.115
No.2

Monthly Meesaq Lahore